تفسیر
سورۃ لہب

سُورَةُ اللَّهَبِ

مَدَنِيَّةٌ ——————— آیات: ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ① مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ② سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ③ وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ④ فِىْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ⑤

ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود ڈھ گیا، نہ اس کا مال اس کے کام آیا نہ اس کی کمائی، وہ جلد بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔ اس کی بیوی بھی ایندھن ڈھوتی ہوئی۔ گلے میں جس کے بٹی ہوئی رسی پڑی ہوگی۔

۱۔ پہلی آیت کی تاویل، سورۂ ماقبل سے تعلق اور اس حقیقت کا انکشاف کہ یہ بد دعا نہیں بلکہ فتح مکہ کی بشارت ہے

سورۃ النصر کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے جس طرح آنحضرت صلعم کی بعثت فتح مکہ پر تمام کی اسی طرح آپؐ کے صحیفۂ نبوت کو اس فتح عظیم کے ذکر پر ختم کیا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حق اپنے مرکز پر پہنچ گیا۔ کیونکہ کعبہ کے مرکز توحید و اسلام ہونے کی وجہ سے (جیسا کہ تفسیر سورۂ بقرہ میں مفصل معلوم ہو چکا ہے) فتح مکہ ہی آنحضرت صلعم کی بعثت کا مرکز تھی اس کے بعد صرف ثبات اور استقامت کی ضرورت تھی، اس کے لیے تین سورتیں اس کے بعد لگا دی گئیں، سورۂ اخلاص جو تمام معارف توحید کا خزانہ ہے، یہ واضح کرنے کے لیے کہ آنحضرت صلعم کی بعثت کی نہایت توحید ہے، اور دونوں معوذتین[۱] دعائے استقامت کی تلقین کے لیے۔

اس ربط کی ایک لطیف مثال اس آیت میں بھی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ — جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جمے رہے، ان پر ملائکہ

---

[۱] سورۂ فلق اور سورۂ ناس۔

عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ — یہ بشارت لے کر اترتے ہیں کہ نہ خوف کرو نہ غم اور تمہارے لیے اس بہشت کی خوشخبری ہے جس کا وعدہ کیے جاتے رہے ہو۔

مفصل بحث معوذتین کی تفسیر میں آئے گی، یہاں صرف اشارہ کافی ہے۔

اس تمہید سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ تمام سورتیں (سورہ نصر، سورۂ اخلاص اور معوذتین) باہم دگر مربوط ہیں۔ اس وجہ سے سورہ لہب کا ان کے درمیان رکھا جانا کسی خاص سبب و حکمت ہی پر مبنی ہو سکتا ہے، ورنہ پورا سلسلۂ نظم درہم برہم ہو جائے گا۔ چنانچہ غور و فکر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سورۂ نصر میں جس فتح و غلبہ کا ذکر ہے، سورہ لہب میں اسی فتح و غلبہ کی وضاحت اور بشارت ہے گویا یوں فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو غلبہ دیا اور اس کے دشمن کو برباد کیا، جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ — حق نمودار ہوا اور باطل مٹ گیا بلاشبہ باطل مٹنے ہی کی چیز ہے۔

اس قسم کے نظم کی نہایت لطیف مثال آنحضرت صلعم کے اس خطبہ میں بھی ہے جو آپ نے فتح مکہ کے موقع پر کعبہ کے دروازے پر دیا تھا۔ آپ نے فرمایا:

لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ صدق وعدہٗ ونصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ۔ — خدائے احد کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندہ کی مدد فرمائی اور یکہ و تنہا دشمنوں کی جماعتوں کو شکست دی۔

بظاہر یہ تین الگ الگ فقرے ہیں، لیکن ایک صاحب نظر کے لیے ان تینوں جملوں کے اندر علی الترتیب تین سورتوں کے مضامین پنہاں ہیں، پہلا فقرہ لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ سورہ کافرون کا ہم مضمون ہے۔ دوسرا جملہ صدق اللہ وعدہٗ ونصر عبدہٗ سورہ نصر کے ہم معنی ہے، تیسرا جملہ ھزم الاحزاب وحدہٗ اور سورہ لہب ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں پس جس طرح یہ تینوں فقرے ایک صاحب نظر کے لیے بالکل مربوط و منظم ہیں، اسی طرح جو لوگ ان تمام سورتوں کے مضامین پر غور کریں گے وہ ان سب کو ایک ہی زنجیر کی بالکل مربوط کڑیوں کی شکل میں پائیں گے۔

آیت تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ کی ہم نے جو تاویل کی ہے اس کی دلیل کسی قدر محتاج تفصیل ہے۔ اس وجہ سے ہم یہاں مختصراً اس کی وضاحت کریں گے۔

عربی زبان میں "تَبَّتْ يَدَاهُ" کا مفہوم یہ ہے کہ "وہ مقابلہ کرنے سے عاجز ہو گیا" کیونکہ "کسر ید" (ہاتھ توڑ دینا) کسی کا زور توڑ دینے اور اس کو عاجز کر دینے کی ایک تعبیر ہے۔ فند الزمانی کا شعر ہے۔

وتركنا ديار تغلب وكسرنا من الغواة الجناھا

(ہم نے تغلب کی سرزمین کو چٹیل بنا کے چھوڑ دیا، اور ان کے سرکشوں کے بازو توڑ ڈالے)

انبیاء کے صحیفوں اور عبرانی زبان میں، جو عربی ہی کی بہن ہے، یہ اسلوب اکثر استعمال کیا گیا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ایسے ہم معنی اور مرادف فقرے بھی آئے ہیں جو اصل مفہوم پر روشنی ڈالتے ہیں۔ صحیفۂ ذی الکفل (حزقیل) کے باب ۳۰ آیات ۲۰-۲۲ میں ہے:
"گیارہویں برس کے پہلے مہینہ کی ساتویں تاریخ کو یوں ہوا کہ خداوند کا کلام مجھے پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد! میں نے مصر کے بادشاہ

فرعون کا بازو توڑا اور دیکھ وہ باندھا نہیں جائے گا۔ دوا کی تدبیر کر کے اس پر پٹیاں کسی نہ جائیں گی کہ تلوار پکڑنے کے لیے مضبوط ہو اس لیے خداوند یہوہ یوں فرماتا ہے کہ دیکھ میں مصر کے بادشاہ فرعون کا مخالف ہوں، اور اس کے بازوؤں کو اسے جو پر زور اور اسے جو ٹوٹا تھا توڑوں گا اور اس کے ہاتھ سے تلوار گراؤں گا۔"

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ "مکسور الید" (شکستہ دست) سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو مقابلہ سے عاجز ہو اور تلوار اٹھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو۔ پس آیت تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ (ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے) نہ تو بددعا ہے اور نہ اس میں کوئی پہلو ہجو اور مذمت کا ہے بلکہ ابولہب کا ذکر کنیت کے ساتھ کیا گیا ہے، جس سے عزت و احترام کا پہلو نکلتا ہے، اس لیے اس آیت کی ظاہر تاویل یہ ہے کہ یہ دشمنانِ خدا کے سرغنہ اور قریش کے فرعون کی ہلاکت کی بشارت ہے، اسی طرح مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ۔ (نہ اس کا مال کام آیا نہ اس کی کمائی) بھی ایک پیشین گوئی ہے جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ہم نے ابولہب کو اس امت کا فرعون کیوں کہا، حالانکہ آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہؓ کی مخالفت میں ابولہب کی سرگرمیاں ابوجہل اور ابوسفیان کی سرگرمیوں اور صف آرائیوں کے مقابل میں کوئی وزن نہیں رکھتی ہیں؟ اس کا سادہ اور واضح جواب تو یہ ہے کہ خدا نے تمام دشمنوں میں سے اسی کا ذکر خاص طور پر کیا ہے اور دوسرے جواب جو غور و فکر کے بعد سامنے آتے ہیں ان کا ذکر آگے آئے گا۔

۲- ابولہب کے خاص طور پر ذکر کرنے کا پہلا سبب

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو سلطان و فرماں روا بنا کر نہیں بھیجا تھا کہ آپ کی دشمنی میں سب سے زیادہ سرگرم امراء و سلاطین اور حریفانِ ملک و سلطنت ہوتے۔ آپ ایک داعی حق تھے، ایک بشیر و نذیر تھے، اور گمراہوں کے لیے شمع ہدایت بنا کر بھیجے گئے تھے، آپ کو تلقین صبر و نماز، اعلائے کلمۂ حق اور نیکی کی تعلیم اور برائی سے روکنے کا حکم ملا تھا، اور دنیا میں اس لیے تشریف لائے تھے کہ خانۂ خدا کو شرک کی آلودگیوں سے پاک کر دیں کہ بانی کعبہ ابراہیم خلیلؑ سے جو وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا ہو جیسا کہ تفسیر سورہ بقرہ میں مفصل گزر چکا ہے۔

اسی وجہ سے آپ کو سب سے پہلے اپنے ان قرابت داروں کو عذاب الٰہی سے ڈرانے کا حکم ہوا جو خانہ کعبہ کے کلید بردار اور متولی تھے۔ انبیاء علیہم السلام کا طریق دعوت ہمیشہ سے یہی رہا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زجر و توبیخ کے سب سے پہلے ہدف علماء یہود ہوئے، کیونکہ امانت الٰہی کے حامل ہونے کے سبب سے سب سے پہلے بازپرس کے مستحق وہی تھے۔ علماء عوام کے لیڈر ہوتے ہیں اس لیے ہدایت و اصلاح کی دعوت سب سے پہلے انہی کو مخاطب کرتی ہے تاکہ ان کی اصلاح عوام کی اصلاح کا ذریعہ بنے۔ اگر انبیائے کرام (علیہم السلام) اپنی دعوت میں راہبرانِ قوم سے چشم پوشی کر جاتے تو یہ دین کے معاملہ میں ایک ناجائز چشم پوشی ہوتی اور اس سے دعوتِ حق کا تمام کاروبار درہم برہم ہو جاتا۔ خواص کو بالکل نظر انداز کر کے صرف عوام کو دعوت دینا انبیاء کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ طریق دعوت باغیوں اور طالبین ملک و دولت کا ہے جو ہمیشہ عوام کو ورغلا کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی مقام انبیائے کرام اور طالبین ملک و جاہ کے درمیان نقطۂ امتیاز ہے جہاں سے دونوں جماعتوں کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔

دیکھو! حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا نے حکم دیا کہ سب سے پہلے فرعون کو مخاطب کریں۔ فرمایا:

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ۝ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓی اَنْ تَزَكّٰی ۝ وَاَهْدِيَكَ اِلٰی رَبِّكَ فَتَخْشٰی (نازعات)

فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی اور کہو کیا میں تجھے تلقین کروں کہ تو پاکی حاصل کرے، اور تیرے رب کی راہ سوجھاؤں کہ تو اس سے ڈرے۔

حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے وقت کے شہنشاہِ اعظم "بنوخذ نصر" (جس کو لوگ بخت نصر کے نام سے جانتے ہیں) کو دعوت دی۔ یرمیاہ نبی نے شمال کے بادشاہوں پر نبوت کی۔ اور حضرت خاتم النبیین صلعم نے متعدد سلاطینِ عالم کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے۔ مفصل بحث کسی دوسرے مقام پر ہوگی۔

تفسیر سورۂ ماعون[1] میں گزر چکا ہے کہ ابولہب خانہ کعبہ کا کلید بردار اور متولی تھا اور اس نے اس دینی ریاست سے سخت ناجائز فائدے حاصل کیے تھے۔ منصب رفادہ کی بدولت اس نے اپنے گھر میں مال و دولت کا ایک بڑا خزانہ جمع کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف اس کی شرک پرستی نے خانہ کعبہ کے پہلے رکن اعظم کو ڈھا دیا۔ دوسری طرف اس کی زر پرستی اور طمع مال نے اس کے دوسرے ستون پر بھی تیشے لگائے جو قربانی کا اصل مدعا تھا، یعنی مساکین کی ہمدردی اور مہمانانِ خدا زائرین بیت اللہ کی خدمت۔ اسی وجہ سے خدا کا غضب جوش میں آیا اور بیت اللہ کی تولیت اس کے ہاتھوں سے چھین لی گئی۔

پس چونکہ آنحضرت صلعم کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد کعبہ کو کفار کے قبضہ سے نکالنا اور اس کو کفر و شرک کی آلودگیوں سے پاک کرنا تھا اس وجہ سے آپؐ نے اس خائن امانتِ الٰہی اور ہادمِ دینِ براہیمی کو جو اہمیت دی وہ قریش نے تمام اربابِ منصب و جاہ میں سے جو ندوہ، قیادت، اور اللواء وغیرہ کے معزز منصبوں پر متمکن تھے کسی کو بھی نہ دی حالانکہ ان لوگوں نے آپؐ کو ایذائیں دی تھیں، انھوں نے آپؐ سے جنگیں کی تھیں، اور آپؐ کو بیت اللہ کے جوار سے نکالا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اپنے منصب دینی کی وجہ سے دینِ الٰہی کا اصلی دشمن یہی تھا، باقی سارا قریش اسی کے تابع فرمان تھا۔

پس جب یہ کہا گیا کہ "ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود ڈھ گیا" تو گویا یہ اعلان کر دیا گیا کہ بنیادِ کفر ہل گئی اور قلعہ شرک و فساد مسمار ہو گیا۔ نصرتِ الٰہی کی بشارت کے بعد یہ پیشین گوئی مسلمانوں کے لیے ایک دوسری بشارت عظمیٰ تھی۔

۳- دوسرا سبب

خداوند تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو حسنِ خلق کا پیکر اور مکارمِ اخلاق کا معلم بنا کر بھیجا تھا۔ قرآن مجید میں ہے۔ اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (تم ایک خلق عظیم کے مالک ہو) آپؐ کا خود ارشاد ہے "بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" (میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں)

تمام مکارمِ اخلاق کا شیرازہ تین چیزیں ہیں، فیاضی، صلہ رحمی، اور کمزوروں کی اعانت۔ عرب ہمیشہ سے ان باتوں کے خوگر تھے۔ اس وجہ سے آنحضرت صلعم نے جب لوگوں کو توحید اور ہمدردی کی دعوت دی تو شرفائے عرب کی جماعت دعوت

---

[1] تفسیر سورہ ماعون مکمل نہ ہونے کے سبب سے اس مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔

کے دوسرے جز (ہمدردی بنی نوع) سے ذرا بھی نہ کھٹکی، البتہ حمایتِ شرک کے جوش اور انکار معاد نے دعوت کے پہلے جز سے اس کو بیزار کیا اور وہ مخالفت پر کمربستہ ہو گئی۔ لیکن ابولہب کا حال اس کے بالکل برعکس تھا۔ آنحضرت صلعم کی مخالفت میں اس کی تمام سرگرمیاں حمایتِ شرک سے زیادہ اس کی زر پرستی اور اس کے حسد کا نتیجہ تھیں۔ یہ بات اس کی سیرت سے بالکل واضح ہے۔ جب قریش نے حمایتِ شرک اور حمیتِ جاہلیت کے جوش سے بے قابو ہو کر پورے خاندان بنی ہاشم کے خلاف مشہور ظالمانہ معاہدہ لکھا اور ان کے مشرک و مومن سب سے مقاطعہ کر لیا تو ابولہب نے تمام تعلقاتِ رحم و قرابت سے بے پروا ہو کر بنی ہاشم کے خلاف قریش کا ساتھ دیا۔ حالانکہ عربوں کے نزدیک قطع رحم سے بڑھ کر کوئی گناہ نہ تھا۔ وہ صلہ رحم کو ہر چیز سے بالاتر سمجھتے تھے اور اس کی قسم دلا کر باہم دگر مدد خواہ اور طالب اعانت ہوتے تھے۔ سورۂ نساء میں ہے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ (نساء-۱)

پس اس خدا اور رحم سے ڈرو جن کا واسطہ دے کر باہم طالب مدد ہوتے ہو۔

یہاں تک کہ یہی چیز ان کے قانونِ اخلاق کی بنیاد قرار پا گئی تھی چنانچہ مشہور شاعر زہیر، ہرم بن سنان کی مدح میں کہتا ہے۔

ومن ضريبته ويعصمه　　من سيّء العثرات الله والرحم

(اس کی طبیعت میں تقویٰ ہے، اللہ اور پاس رحم اس کو ظلم و معصیت کی لغزشوں سے بچاتے ہیں)

اس کی تفصیل سورۂ نساء کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

ابولہب نے اس نازک وقت میں بنی ہاشم سے قطع تعلق کر کے اپنے لیے سب سے بڑی ذلت خود پسند کر لی۔ اگر اس کے خون میں عربی حمیت اور شرافت نفس کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو وہ ابوطالب کے نقش قدم پر چلتا جو اپنے آبائی دین پر قائم رہتے ہوئے آخر دم تک آنحضرتؐ پر قربان ہوتے رہے۔ یا حضرت حمزہؓ کی تقلید کرتا جو صرف اس جوش غیرت کی وجہ سے مسلمان ہو گئے کہ ابوجہل نے ان کے بھتیجے (آنحضرت صلعم) کے ساتھ بدسلوکی کی تھی۔

الغرض آنحضرت صلعم کے ساتھ ابولہب کی دشمنی اور بنی ہاشم سے اس کی کنارہ کشی کسی دینی جذبہ پر مبنی نہیں تھی۔ قریش کے لیے سب سے بڑی مذہبی جنگ بدر کا معرکہ تھا۔ اس معرکہ میں تمام سردارانِ قریش حمیتِ مذہب کے نشہ سے سرشار ہو کر پیغمبرِ اسلام کو شکست دینے کے لیے میدان میں اتر آئے لیکن ابولہب اس موقع پر گھر میں بیٹھا رہا (جیسا کہ فصل ۸ میں معلوم ہوگا) اگر اس میں دینی غیرت کی کوئی چنگاری بھی ہوتی تو اس موقع پر وہ ضرور مشتعل ہوتی، اور تمام سردارانِ قریش کی طرح وہ بھی میدانِ جنگ میں آ کودتا۔

ابوجہل کے جوش غیرت کا یہ عالم تھا کہ جب فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو چلایا:

اللهم اقطعنا للرحم وآتانا بما لا يعرف فاحنه الغداة

خداوندا! ہم میں جو سب سے زیادہ رشتۂ رحم کا توڑنے والا اور اس بری بات (جنگ) کا باعث ہوا ہو اس کو کل شکست دے۔

یہ دعا اگرچہ حمیت جاہلیت کے زہر میں بجھی ہوئی ہے۔ لیکن اس میں ابوجہل کی شرافتِ نفس اور پاسِ رحم کا جو پہلو نمایاں ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔

ابوسفیان پر جب تمام راہیں بند ہو گئیں تو صلہ رحم کو شفیع بنا کر طلب عفو کے لیے آستانۂ نبوت پر حاضر ہوئے۔ لیکن غزوۂ

حمیت اور جوشِ غیرت کا یہ حال تھا کہ دل کا بھید کھولنے میں دروغ مصلحت آمیز کا ننگ نہ گوارا کر سکے۔ توحید کا تو صاف اقرار کیا لیکن آنحضرت صلعم کی رسالت کے بارے میں جو تردد تھا اس کو اس موقع پر بھی بے دریغ ظاہر کر دیا۔

یہ دونوں قریش کے سردار اور عرب جاہلیت کے سرخیل تھے، دیکھو! ان کی ہر بات میں غیرت و حمیت کی شان کتنی نمایاں ہے۔ برعکس اس کے ابولہب کی اسلام کے ساتھ دشمنی قومی عصبیت اور مذہبی حمیت کی روح سے بالکل خالی ہے۔ اس نے بنی ہاشم سے ان کے مقاطعہ کے موقع پر علیحدگی اختیار کر کے جس بے غیرتی کا ثبوت دیا اس کے لیے کوئی عذر تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ رفادہ کا مال خورد برد کرتا تھا اور اس پر قابض رہنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ قریش کا ساتھ دے۔ چنانچہ دوسری آیت میں اس کی اسی حرکت پر تعریض ہے جس کی شرح ہم آگے کریں گے۔

ابولہب کی دناءت اور زرپرستی عالم آشکارا تھی۔ چنانچہ عرب کے سب سے زیادہ معزز اور فیاض خاندان سے ہونے کے باوجود کعبہ سے سونے کے ہرن کی چوری کا الزام اسی پر لگایا گیا۔ ان باتوں سے ہمارا یہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے کہ اس میں نہ تو ابوجہل کی سی دینی و قومی غیرت تھی کہ آنحضرت صلعم کی مخالفت اس جوش کا نتیجہ ہو، اور نہ اس کو ابوسفیان کی طرح سرداری حاصل تھی کہ اس کے لیے حریفانہ کاوش پیدا ہوا، بلکہ اس کا تمام بغض و عناد آنحضرت صلعم کی تعلیم کے سبب سے تھا۔ آپؐ فیاضی کا حکم دیتے تھے، بخل کی مذمت فرماتے تھے، یتیموں اور مسکینوں کی دستگیری کی لوگوں کو نصیحت کرتے تھے، غلام آزاد کرنے کا اجر و ثواب بیان فرماتے تھے، اور قحط و مصیبت کے ایام میں بنی ہاشم کی طرف سے غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کی جو مقدس سنت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار تھی اس کو قائم رکھنے کی نصیحت فرماتے تھے۔ یہ تمام تعلیم تزکیۂ نفس اور تولیتِ بیت اللہ کے منصبِ عظیم کے لیے ضروری تھی، لیکن ابولہب کے لیے اس کا ایک ایک لفظ برقِ خرمن سوز تھا کیونکہ اس سے اس کے بخل و خیانت کا تمام اندوختہ معرضِ خطر میں پڑ گیا۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ابولہب صرف شرک ہی نہ تھا بلکہ خیر و کرم کے تمام اخلاقِ حسنہ کا دشمن بھی تھا اور جیسا کہ سورہ ھمزہ میں فرمایا گیا ہے صرف دنیا کی زندگی پر قانع ہو گیا۔

ان وجوہ سے یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ کے دشمنوں کا سرغنہ اور خیر و صلاح کے مخالفین کا سرخیل تھا۔ اور آپ کے سب سے زیادہ جاں نثار وہ لوگ تھے جو سب سے زیادہ فیاض اور پرہیزگار تھے۔ اس پر مفصل بحث سورۃ واللیل کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

۴۔ تیسرا سبب

ابولہب کے منصب اور اس کی اخلاقی دناءت سے ہم نے جو استدلال کیا ہے پچھلی دو فصلوں میں گزر چکا ہے اب اسلام کی مخالفت میں اس کی پیش قدمیوں کو دیکھو۔ ان کا تقاضا بھی یہی تھا کہ تمام اعدائے اسلام میں سے اس کا ذکر خاص طور پر کیا جاتا۔ ابتدا میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت شروع کی تو کسی طرف سے کوئی صدائے مخالفت نہیں اٹھی۔ آپؐ کی تمام پچھلی زندگی جو امانت و تقویٰ کی ایک بے مثال سیرت تھی، سب کی نگاہوں کے سامنے تھی، جس کی کشش قریب تھا کہ لوگوں کو آپؐ کی دعوتِ حق کی طرف کھینچ لے۔ لیکن ابولہب نے سبقت کی اور دعوت اسلام کی راہ میں ایک بھاری چٹان کی طرح جم گیا، اور اپنی فتنہ انگیزیوں سے پرشوق دلوں کو بیزار اور راغب طبیعتوں کو متنفر کرنے لگا۔

ابتدا میں جب آنحضرت صلعم کو تبلیغ و دعوت کا حکم ہوا تو ایک دن آپؐ نے کوہ صفا پر چڑھ کر "یا صباحاہ" کا نعرہ لگایا یہ نعرہ سن کر تمام اہل مکہ آپؐ کے پاس جمع ہو گئے۔ آپ نے فرمایا:

انی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید۔	اے لوگو! میں تمھارے لیے ایک آنے والے عذاب شدید سے ڈرانے والا ہوں۔

ابولہب نے جواب میں کہا۔

تبا لک الھذا دعوتنا	غارت ہو! اسی لیے تم نے ہم کو بلایا ہے۔

دوسرے موقع پر اسی امر الٰہی کی تعمیل کے لیے آپؐ نے دعوت کا سامان کیا اور اپنے تمام قرابت داروں کو بلایا جب لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تو آپؐ نے کچھ ارشاد فرمانا چاہا لیکن ابولہب نے بات کاٹ دی اور لوگوں کو مخاطب ہو کر کہا۔

لقد ما سحرکم صاحبکم	تم لوگوں پر یہ پہلے ہی سے جادو چلا رہے تھے۔

یہ سن کر لوگ منتشر ہو گئے اور آنحضرت (صلعم) کو کچھ فرمانے کا موقع نہ مل سکا۔

جب آنحضرت (صلعم) خاندان کے لوگوں سے مایوس ہو گئے تو آپؐ نے موسم حج میں تمام قبائل عرب کے سامنے اپنی دعوت پیش کی۔ اس وقت ابولہب آپ کے پیچھے پیچھے ہوتا اور لوگوں کو آپؐ سے بدگمان کرنے کے لیے یہ منادی کرتا پھرتا۔

یا بنی فلان ان ھذا یدعوکم الی ان تسلخوا اللات والعزی من اعناقکم وحلفاءکم من الجن من بنی مالک ابن اقیش الی ما جاء بہ من البدعۃ والضلالۃ فلا تطیعوہ ولا تسمعوا لہ	اے بنی فلاں! یہ شخص چاہتا ہے کہ تم لات و عزیٰ سے برگشتہ ہو کر اور بنی مالک ابن اقیس کے جنات حلفاء سے قطع تعلق کر کے اس کی لائی ہوئی بدعت و ضلالت قبول کر لو۔ پس تم اس کی بات ہرگز نہ مانو۔

وہ اسی اسلام دشمنی اور عداوتِ حق پر قائم رہا۔ یہاں تک کہ اسی رنج و غم نے اس کو ہلاک کر دیا۔ مفصل بحث تیسری آیت کی تفسیر کے ذیل میں آئے گی۔

۵۔ چوتھا سبب

پچھلی فصلوں میں ابولہب کے خاص طور پر ذکر کرنے کے وہ اسباب معلوم ہو چکے جو اس سورہ کا ربط سابق سورہ سے واضح کرتے ہیں۔ نیز یہ بات بھی معلوم ہو چکی کہ یہ بددعا اور مذمت نہیں ہے لیکن ابولہب کو خاص طور پر ذکر کرنے کا ایک اور پہلو بھی ہے، جس سے ایک طرف گذشتہ مباحث کی تائید ہوتی ہے اور دوسری طرف ایک نئی حقیقت روشنی میں آتی ہے جو اس سے پہلے نہیں آئی ہے یعنی اس میں دشمنانِ خدا سے براءت اور سب سے کٹ کر خدائے واحد سے رشتہ جوڑنے کا مضمون پنہاں ہے۔ اس پہلو سے یہ سورہ اس اخلاص و توحید کی تمہید ہے جس کا ذکر بعد کی سورہ میں آ رہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب خداوند تعالیٰ نے ان تمام کفار و مشرکین کو جو آنحضرت (صلعم) کو ایذا دینے میں سرگرم تھے۔

چھوڑ کر آپؐ کے چچا کا ذکر ان سخت الفاظ میں کیا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ آزرؔ کی مثال کی طرح ایک مثال ہے تاکہ ہم کو اس سے یہ تعلیم دی جائے کہ جن کے اعمال خدا سے دور کرنے والے ہوں گے وہ نیکوں کے رشتہ و قرابت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہاں تک کہ اس نبی کا رشتہ بھی ان کے لیے کچھ سود مند نہیں ہو سکتا جو خدا کو سب سے زیادہ محبوب ہے، جیسا کہ خدا نے خود فرمایا ہے۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (سورہ ممتحنہ)

قیامت کے دن تمہارے رشتے اور تمہاری اولاد تمہارے کام نہ آئیں گی۔ اللہ تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا اور اللہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے تمہارے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے، جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان سے جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو بری ہیں، ہم نے تمہارے عقیدہ اور عمل کا انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور دشمنی رہے گی برابر یہاں تک کہ تم اللہ واحد پر ایمان لاؤ۔ مگر ابراہیمؑ کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں آپ کے لیے خدا سے مغفرت کی دعا کروں گا گو آپ کے بارہ میں مجھے خدا کی طرف سے کوئی اختیار نہیں۔ اے ہمارے رب ہم نے تجھ پر بھروسہ کیا اور تیری طرف مائل ہوئے اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (سورہ توبہ۔ ۱۱۴)

ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کرنا محض اس وعدہ کا ایفا تھا جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا پس جب اس پر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ وہ خدا کا دشمن ہے وہ اس سے بری الذمہ ہو گیا۔ بے شک ابراہیم نرم دل اور بردبار تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اتمام حجت کا فرض پورے طور پر ادا کر چکنے کے بعد، جس طرح حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ سے کنارہ کش ہو گئے اسی طرح اتمامِ دعوت اور ہجرت کے واجب ہو جانے کے بعد پیغمبر عالمؐ نے اپنے چچا کے خلاف اعلان حق کر دیا۔ ابولہب کے لیے یہ زخم نہایت کاری تھا کیونکہ یہ اعلان اس ذاتِ اقدس کی طرف سے ہوا تھا جو تمام دنیا کے لیے عموماً اور اپنے رشتہ داروں کے لیے خصوصاً سراپا مہر و محبت تھی اور جو ان کی مغفرت کے لیے اس وقت تک مشغولِ دعا رہی جب تک خدا نے اس کی ممانعت نہیں فرما دی۔

اس پہلو سے یہ سورہ ہمارے لیے خدا کی گرفت کی ایک نہایت عبرت انگیز مثال ہے کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر پیغمبر عالمؐ کا چچا بھی نافرمانی اور سرکشی کرے تو خدائے قہار کی پکڑ سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس سے ہم کو یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ تمام امر و حکم صرف خدا ہی کے اختیار میں ہے، وہ عدل اور حق کو قائم کرنے والا ہے۔ اس کی عدالت خاندان و نسب اور عزت و جاہ کے زور و اثر

سے بالاتر ہے۔ اس وجہ سے اس کے سوا تمام سہارے جھوٹے اور تمام وسیلے باطل ہیں۔ اسی کا نام سہارا اور اسی کی ذات پناہ ہے۔ پس اسی کو راضی کرنا وسیلۂ نجات ہے۔ کیونکہ کوئی سفارش بغیر اس کے اذن نہیں ہو سکتی۔ وہ بے نیاز اور بے ہمتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

کہہ کہ وہ اللہ بے ہمہ ہے۔ اللہ با ہمہ ہے۔ نہ وہ باپ ہے نہ وہ بیٹا ہے، نہ کوئی اس کی برابری کا ہے۔

باطل پرستوں کو گمان تھا کہ خدا کے بیٹے بیٹیاں ہیں جو اس کے بندوں کی شفاعت کریں گے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کا یہ عقیدہ نقل کیا گیا ہے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر۔ ۳)

ہم ان کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا سے قریب کر دیں۔

خداوند تعالیٰ نے ابولہب کا انجام بیان فرما کر ان تمام باطل امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس پہلو سے یہ سورہ مابعد سورہ سے مربوط ہوتی ہے۔

۶۔ یہ سورہ بد دعا اور مذمت نہیں بلکہ پیشین گوئی اور خوشخبری ہے

عام خیال یہ ہے کہ ابولہب نے آنحضرت صلعم کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

تبًّا لك الهذا دعوتنا

تم ہلاک ہو، تم نے ہم کو اسی لیے بلایا ہے۔

اس کے جواب میں خداوند تعالیٰ نے ابولہب اور اس کی بیوی کی مذمت میں یہ سورہ اتاری کہ آنحضرت صلعم کو ابولہب کی گستاخی سے جو رنج پہنچا تھا وہ رفع ہو جائے۔ لیکن صحیح تاویل روشن ہو جانے کے بعد کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس رائے کو قبول کریں۔ اس کے وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ یہ صحیح ہے کہ ابولہب نے ذاتِ رسالت کی شانِ اقدس میں نہایت سفیہانہ اور گستاخانہ الفاظ استعمال کیے تھے لیکن قرآن مجید جاہلوں سے درگزر کرنے اور ان سے عمدہ و شائستہ لب و لہجہ میں خطاب کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ فرمایا ہے،

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (النحل۔ ۱۲۵)

اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلاؤ اور ان کے ساتھ اس طریقہ سے بحث کرو جو اچھا طریقہ ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ (الحجر۔ ۹۴-۹۵)

پس تم کو جس بات کا حکم ملا ہے اس کا اعلان کرو اور مشرکین سے اعراض کرو۔ مذاق اڑانے والوں کے لیے تمہاری طرف سے ہم کافی ہیں۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ (الحجر۔ ۸۵)

بلاشبہ قیامت ضرور آنے والی ہے پس خوب صورتی سے درگزر کرو۔

ایک جگہ ہے:

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۔ پس ان سے درگزر کرو اور کہو سلام۔ یہ عنقریب جان لیں گے

اسی طرح اپنے خاص بندوں کی تعریف میں فرمایا۔

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا (فرقان ۶۳) جب ان کو جاہل مخاطب کرتے ہیں وہ کہتے ہیں سلام!

حضرت ابراہیم اور ان کے باپ کے مکالمے میں ہے۔

قَالَ أَرَاغِبٌ أَنْتَ عَنْ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا (مریم ۴۶-۴۷)

کہا اے ابراہیم کیا تم میرے معبودوں سے برگشتہ ہو رہے ہو؟ اگر تم اس باز نہ آئے تو میں تم کو سنگسار کر دوں گا اور تو میرے سامنے سے دور ہو۔ ابراہیم نے جواب دیا، سلام علیک! میں آپ کے لیے اپنے رب سے مغفرت کی دعا کروں گا، وہ میری بڑی خبر رکھنے والا ہے۔

آنحضرت صلعم کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے نقش قدم پر چلنے کا حکم ہوا تھا، آپ ان کے تمام خصائل و خصائص کے وارث تھے اور منکرین حق کی دلآزاریوں اور بدزبانیوں پر آپ کو صبر کی تعلیم فرمائی گئی تھی۔

وَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۔ (مزمل - ۱۰) ان کی باتوں پر صبر کرو، اور ان کو خوب صورتی کے ساتھ چھوڑ دو۔

پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ آپ اس اعلیٰ اور پاکیزہ روش کو چھوڑ کر کوئی اور روش اختیار فرماتے۔

۲- پھر اگر منشاء الٰہی یہی تھا کہ ابولہب کی مذمت کر کے آنحضرت صلعم کا غصہ اور ملال دور کیا جائے تو آپ کو کفار کا مثلہ کرنے سے کیوں روکا گیا؟ حالانکہ انھوں نے آپ کے جان نثار رضاعی بھائی اور محبوب چچا حضرت حمزہؓ کے جسم اقدس کا مثلہ کر کے آپ کو انتہائی صدمہ پہنچایا تھا۔

۳- اگر پیغمبر عالم (صلعم) اپنے دل کی بھڑاس ہی نکالنا چاہتے تو ان کے جان نثاروں کی بے پناہ تلواروں سے اہل مکہ کو کون پناہ دے سکتا تھا؟ حالانکہ آپ نے ان سب کے لیے امنِ عام کی منادی کر دی اور کسی کو معمولی تکلیف دینا بھی گوارا نہ فرمایا۔ بلاشبہ آپ نے ظالموں اور عہد شکنوں کے خلاف جہاد کیا۔ لیکن یہ کوئی انتقامی کارروائی نہ تھی۔ اس کا مقصود عدل کا قیام تھا تاکہ خدا کی زمین شر و فساد سے پاک ہو جائے۔ آپ کی پوری زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں مل سکتا جس کو ذاتی انتقام کی مثال میں پیش کیا جا سکے۔ آپ نے ہمیشہ سختی کا جواب نرمی اور بدسلوکی کا جواب لطف و محبت سے دیا۔ یہ آپ کے خلقِ عظیم کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے۔

۴- اگر خدا اور رسول کسی خاص کافر کی ہجو اور مذمت ہی پر اتر آتے تو اس کے سب سے زیادہ مستحق ابوجہل اور رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی تھے لیکن معلوم ہے کہ ان کے بارہ میں بھی آنحضرت صلعم سے کوئی ایسا کلمہ منقول نہیں جس کو مذمت سے تعبیر کیا جا سکے۔

۵- قرآن مجید میں کفار کی مذمت ہمیشہ بطریق کنایہ کی جاتی ہے۔ تعیین و تشخیص اس کا اسلوب کلام نہیں۔ وہ مطلق طور پر بری صفتوں کی مذمت کرتا ہے نہ کہ نام لے کر۔

۶- اسی اصول پر آنحضرت صلعم بھی ہمیشہ بطریق کنایہ مذمت فرماتے تھے۔ مثلاً آپ فرماتے مابال قوم یفعلون کذا وکذا

(ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو ایسا ایسا کرتے ہیں)

۷- کتب سابقہ میں آنحضرت صلعم کی تعریف آئی ہے کہ "وہ سخت کلام نہ ہوگا" مجھے خیال آتا ہے کہ شاید یہ چیز آنحضرت صلعم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان بطور ایک امتیازی فرق کے بتلائی گئی ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کے کلام میں مذمت کی مثالیں بہت ہیں۔ گو یہ ممکن ہے کہ یہ نصاریٰ کی تحریف ہو اور میرے نزدیک یہی پہلو راجح ہے۔

متی باب ۱۲ آیت ۳۴ میں ہے:

"اے سانپ کے بچو! تم برے ہو، کیونکر اچھی باتیں کہہ سکتے ہو؟"

مرقس باب ۱۲ آیت ۳۳ میں ان کے افضل ترین خلیفہ شمعون صفا کے متعلق ان کا یہ فقرہ منقول ہے۔

"پطرس (صفا) کو ملامت کیا اور کہا اے شیطان! میرے سامنے سے دور ہو"

اس کی مثالیں انجیل میں بہت ہیں۔

۸- آنحضرت صلعم کی نسبت معلوم ہے کہ آپ نہایت باحیا اور پاکیزہ کلام تھے۔ اس وجہ سے آپ کے اخلاق اور آپ کی شان دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی زبان سے جو کچھ نکلے وہ پاکیزگی اور لطافت کا نمونہ ہو۔

۹- لسان الٰہی نے نام لے کر اس کی بھی مذمت نہیں کی، جو عزت و شرف کے لحاظ سے تمام کفار کا سرخیل تھا، جس کی قیادت میں ان کی فوجیں صف آرا ہوا کرتی تھیں، جو قبائل کا سردار اور جماعتوں کا لیڈر تھا، اور جس کی آتش بیانی دلوں کے اندر طوفان برپا کر دیتی تھی، پھر وہ ایک ارذل ترین خلائق کے ذم و شتم سے آلودہ ہونا کیونکر گوارا کرتی ؟

۱۰- لیکن ان سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ تاویل سورہ کے محل و مقام کے لحاظ سے بالکل نامناسب اور بے ربط ہے۔ ماقبل سورہ میں فتح مکہ اور استغفار و تسبیح کا ذکر ہے۔ اور مابعد سورہ میں توحید کامل کا اعلان کیا گیا ہے۔ ان دو عظیم الشان مسئلوں کے بیچ میں ہجو اور مذمت کا کیا موقع تھا، ان تمام مذکورہ بالا وجوہ میں سے ہر وجہ اس تاویل کے قبول کرنے سے مانع ہے۔

۷- تاویل میں غلط فہمی کے اسباب

اس سورہ کو ہجو اور مذمت یا بددعا کے معانی میں لینے کے بظاہر صرف چار اسباب ہیں اور یہ سارے اسباب ضعیف اور ناقابل اعتنا ہیں۔ لیکن ہم ان کو بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں، تاکہ ایک طرف ارباب تاویل کا عذر واضح ہو جائے دوسری طرف ان کی کمزوریاں سامنے آ جائیں۔

۱- ابولہب نے آنحضرت صلعم کو مخاطب کر کے کہا تَبًّا لَكَ ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ویسا ہی جواب دے دیا۔ اس پر مفصل بحث گزر چکی ہے۔

۲- ماضی کا صیغہ یا تو خبر کے لیے آتا ہے یا انشاء کے لیے چونکہ یہ سورہ ابولہب کی ہلاکت سے پہلے نازل ہوئی ہے اس وجہ سے یہاں صیغہ ماضی بمعنی انشاء کے ہوگا اور مفہوم اس کا لعنت کا ہوگا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے تربت یداہ، شلت یمینہ اس کے ہاتھ خاک آلود ہوں۔ اس کے ہاتھ شل ہو جائیں۔

اس کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ ماضی کا صیغہ دراصل خبر کے لیے ہے اور بعض اوقات خبر ایسے واقعات کی دی جاتی ہے جو واقع ہونے والے ہوتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی پیشین گوئی ہوتی ہے، جو لوگ صحف سماوی اور قرآن مجید کی پیشین گوئیوں کے اسلوب سے آشنا ہیں ان کو یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں ہوگی کہ تَبَّتْ یَدَاۤ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ مَاۤ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ایک واقع ہونے والے امر کا اعلان ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ — اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا پس اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔

یوحنا نے اپنے مکاشفات میں کہا۔

عظیم الشان بابل ڈھ گیا۔

حالانکہ یہ قول بابل کے ڈھنے سے پہلے کا ہے۔

بعد کی آیت سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ کا خبر ہونا قطعی ہے۔ اس وجہ سے اس کا اقتضا بھی یہی ہے کہ پہلی آیت خبر ہی ہو۔ متصل آیت مَاۤ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ پیشین گوئی ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ سابق سورہ کے متعلق اتفاق رائے ہے کہ اس میں خبر دی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ سورہ بھی اسی کے مشابہ ہے۔

۳- تیسری مقبولِ عام وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے اس جملہ کو تبت یداہ کے مفہوم میں لیا ہے۔ حالانکہ محض یہ بات ان کے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کیونکہ دعا کے لیے مخصوص صیغے ہوتے ہیں اور تباب سے دعا کے لیے صرف تبًّا کا لفظ مستعمل ہے، اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کے دوسرے مشتق بھی دعا کے لیے مستعمل ہیں جب بھی وہی تاویل صحیح ہوگی جو سیاق و سباق سے اشبہ، صاف اور خوب صورت ہو۔

۴- چوتھی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ منصوب للذم ہے۔ حالانکہ اس کے منصوب ہونے کی علت ذم کو قرار دینا نہایت کمزور دلیل ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ حال واقع ہے۔ فصل ۹ میں اس کا مفصل بیان آئے گا۔

۸- دوسری آیت کی تاویل اور پیشین گوئی کی صداقت

۸- جہاں تک تاویل کا تعلق ہے یہ واضح ہوچکا کہ یہ سورہ، سورۂ سابقہ کی طرح خبر یا پیشین گوئی ہے۔ اب تاریخ کی روشنی میں دیکھو یہ پیشین گوئی کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی۔

بدر کا معرکہ تاریخ اسلام میں سب سے زیادہ عظیم الشان معرکہ ہے۔ خدا نے اس کو 'یوم الفرقان' کہا ہے اور پیغمبر صلعم سے فتح و نصرت اور آپ کے دشمنوں کو ہلاک کرنے کا جو وعدہ فرمایا گیا تھا پہلی مرتبہ اسی دن پورا ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دن دعا فرمائی اَللّٰهُمَّ اَنْجِزْ لِیْ مَا وَعَدْتَنِیْ (خداوندا تو نے مجھ سے جو وعدہ فرمایا ہے وہ پورا کر) چنانچہ خدا نے آپؐ کو تمام سردارانِ قریش کی قتل گاہیں دکھائیں اور آپؐ نے اپنے صحابہؓ کو دشمنانِ دین میں سے ایک ایک کی قتل گاہ دکھائی۔

اس لڑائی کے لیے قریش کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنی پوری طاقت میدان جنگ میں ڈال دی۔

ان کا ایک ایک بچہ نشۂ جنگ سے سرشار تھا۔ حضرت عباسؓ کو ایک حد تک آنحضرت صلعم سے محبت تھی تاہم جوشِ عام کا سیلاب ان کو بھی میدانِ جنگ میں کھینچ لایا۔ لیکن ابولہب اس تاریخی معرکے میں شریک نہیں ہوا۔ اس نے اپنی جگہ عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بھیجا۔ عاص پر ابولہب کے چار ہزار درہم قرض آتے تھے۔ وہ تنگدستی کے سبب سے قرض ادا کرنے کے قابل نہ رہا۔ ابولہب نے روپیہ ڈوب جانے کے اندیشہ سے سنگدل بخیلوں کے عام اصول کے مطابق، عاص کی جان اسی رقم کے عوض خرید لی۔ اور اپنا قائم مقام بنا کر اس کو بدر کے میدان میں بھیجا۔

عرب ناموس کی حفاظت کے لیے مال و دولت کو ڈھال خیال کرتے تھے، ابولہب نے بھی یہ ڈھال استعمال کی اور چاہا کہ اس ایک ہی سپر سے ناموس اور جان دونوں کو بچالے جائے۔ لیکن ائمۂ کفر کے لیے خدا کا جو فیصلہ ہوچکا تھا وہ ابولہب پر پورا ہو کے رہا۔ معرکۂ بدر کے ساتویں دن وہ چیچک (عدسہ) میں مبتلا ہوا اور اسی بیماری میں ہلاک ہوگیا۔ اس کے دونوں بیٹوں نے چھوت لگ جانے کے خوف سے دو تین دن تک اس کی لاش گھر ہی میں پڑی رہنے دی، یہاں تک کہ اس کا تمام جسم سڑ گیا۔ کئی دن کے بعد ایک شخص کے غیرت دلانے پر جب ان کو اس کے دفن کرنے کا خیال ہوا تو دور ہی سے جسم پر کچھ پانی ڈالا۔ پھر لاش کو مکہ کے بالائی حصہ میں لے گئے اور ایک دیوار کے پاس رکھ کر دور ہی سے پتھر وغیرہ پھینک کر اس کو ڈھانک دیا۔

اس جگہ یہ بات لحاظ رکھنی چاہیے کہ کسی پر پتھر پھینکنا لعنت ہے۔ جیسا کہ ہم سورۂ فیل کی تفسیر میں بیان کرچکے ہیں۔

اب غور کرو لسانِ غیب نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی۔

۱- ابولہب مقابلہ کرنے سے عاجز رہا۔ اس نے اپنی تلوار نہیں اٹھائی، اور میدانِ جنگ میں آنے سے اس نے گریز کیا۔

۲- اس کے اکثر اعوان قتل ہوئے۔ اگر اشارات فہم حقیقت کے لیے کافی ہیں تو یدین سے اعوان و انصار کو مراد لینا نہایت واضح بات ہے کیونکہ عرب اعوان و انصار کو یدین کہتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے۔ وھم ید علی من سواھم (اور وہ غیروں کے مقابل میں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں) باقی رہا اس سے علم و عمل کے ہاتھ مراد لینا جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے تو میرے نزدیک یہ بالکل لغت کے خلاف اور محض تفسیر بالرائے ہے۔

۳- ابولہب کا مال اس کے کام نہ آیا۔ کیونکہ اس نے ایک شخص کو میدانِ جنگ میں جانے کے لیے خریدا تاکہ اس طرح اپنی جان بچالے جائے۔ لیکن اس تدبیر سے وہ اپنے کو موت کے حملہ سے بچا نہ سکا۔

۴- اپنی قوت و شوکت کی بربادی کے ساتھ وہ خود بھی ہلاک ہوگیا۔

۵- مَا كَسَبَ سے حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک اس کے بیٹے مراد ہیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو تاویل کے نقطہ نظر سے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ کیونکہ حقیقی معنی کی رعایت کے ساتھ کسی لفظ کی وسعت ان تمام معانی کو اپنے اندر سمیٹ سکتی ہے جو اس کے دائرے میں آسکتے ہوں۔ بہرحال اگر "مَا كَسَبَ سے" اس کے بیٹے ہی مراد ہیں تو تاریخ سے ثابت ہے کہ ابولہب کے بیٹے اس کے کام نہ آئے۔ کیونکہ اس کی آخری مصیبت میں انھوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ دوسرا پہلو یہ ہوسکتا ہے کہ مَا كَسَبَ سے اس کی وہ کمائی مراد لی جائے جو حرام و حلال ہر راہ سے اس نے جمع کی تھی۔

ان دونوں تاویلوں میں سے جو تاویل بھی اختیار کی جائے، دونوں صورتوں میں ربط کا پہلو ایک ہی رہے گا۔ وہ یہ کہ جس

چیز نے اس کو بخل و خیانت پر آمادہ کیا وہ چیز اس کے کام نہ آسکی۔ انسان کے دین و تقویٰ کے لیے سب سے بڑا فتنہ مال و دولت اور اس کے اہل و عیال ہیں، چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۶۴-۱۵) تمہارے مال اور اولاد فتنہ ہیں۔

دوسری جگہ ہے:

اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ (۶۴-۱۴) تمہاری ازواج اور تمہاری اولاد میں تمہارے دشمن ہیں۔

یہ حقیقت اس قدر واضح ہے کہ اس سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ جمع مال میں مردوں کا غیر معتدل انہماک زیادہ تر عورتوں کی آرائش پسندی اور ان کی فرمائشوں کی تعمیل ہی کے لیے ہوتا ہے جس کا نتیجہ دونوں کی بربادی ہے۔ ان امور کو پیش نظر رکھنے کے بعد آیت کی تاویل یہ ہوگی کہ جن چیزوں کو اس نے قوت و عزت خیال کیا یعنی مال و اولاد، انھوں نے اس کو کوئی نفع نہیں پہنچایا۔ قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کی زبانی کہا گیا ہے۔

مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ (۶۹-۲۸ و ۲۹) میرا مال میرے کام نہ آیا۔ میری طاقت میرے ہاتھوں سے چھن گئی۔

مال اور اہل و عیال کے عشق نے ابولہب کو حرص اور خیانت پر آمادہ کیا لیکن خدا کی گرفت کے وقت وہ کچھ کام نہ آئے۔ تاویل کا یہ پہلو اس آیت کا تعلق بعد کی آیت سے واضح کرتا ہے۔

یہاں تک پہلی اور دوسری آیت کی تاویل سے متعلق جتنی ضروری باتیں تھیں بیان کی گئیں۔ اب صرف یہ سوال باقی رہ گیا کہ ابولہب کا ذکر کنیت کے ساتھ کیوں کیا گیا؟ آئندہ فصل میں اس سوال کا جواب ہے۔

۹۔ تیسری آیت کی تاویل اور عمل و جزاء کی مشابہت

خداوند تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ جو لوگ اس مسجد کی حرمت برباد کریں گے جس کا نام اس نے بیت اللہ رکھا ہے، وہ لوگ ہلاک ہوں گے۔ چنانچہ فرمایا:

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۲۲-۲۵) اور جو اس میں بے دینی یعنی شرک کا ارتکاب کرنا چاہیں گے ہم ان کو دردناک عذاب کا مزا چکھائیں گے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس کا یہ فیصلہ ہمیشہ پورا ہوا۔ اس نے خائنوں اور غداروں کا اقتدار بیت اللہ پر کبھی قائم نہیں رہنے دیا۔ اس کی تفصیل سورہ ماعون کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ اسی اصول کے مطابق خداوند تعالیٰ نے اس خائن کی ہلاکت کی خبر کے بعد اس کے اس انجام کی خبر دی ہے جس سے وہ اس عذاب دنیاوی کے بعد دوچار ہوگا۔ فرمایا:

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ وہ جلد بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان آخرت میں اپنے عمل کے مناسب جزا پائے گا۔ بلکہ خود اس کا عمل ہی اس کی جزا بنے گا جو اس نے بویا ہے وہی کاٹے گا اور جو لگایا ہے اسی کا پھل کھائے گا۔ جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے:

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵۲-۱۶) تم جو کرتے تھے وہی بدلہ میں پا رہے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا:

ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ (۳۹-۲۴) جو تم نے کیا ہے وہ چکھو۔

اس اصل کو پیش نظر رکھ کر اگر ابولہب کے حالات اور اس اجزاپر غور کروگے جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے تو دونوں میں نہایت واضح مناسبت پاؤگے۔

ابولہب نہایت تندمزاج اور شعلہ رو تھا۔ اسی وجہ سے اس کی کنیت "ابولہب" ہوئی اور یہ کنیت اس قدر مشہور ہوئی کہ اس کا اصلی نام "عبدالعزیٰ" اس کے مقابل میں بالکل غائب ہو کے رہ گیا۔ اگر یہ شخص عقلمند ہوتا تو اپنے اندر حلم و کرم اور محبت و ہمدردی کے جذبات پیدا کرکے اپنے نفس کو قابو میں کرتا اور تندمزاجی و طماعی کی خباثت کی جگہ عزت و شرف کے حصول کی کوشش کرتا۔ سموئل کا شعر ہے۔

وان ھو لم یحمل علی النفس ضیمها فلیس الی حسن الثناء سبیل

(اگر وہ اپنے نفس کو اس چیز پر مجبور نہ کرے گا جس سے اس کا نفس بھاگتا ہے تو پھر مدح و ستائش کے حصول کا کوئی راستہ نہیں ہے)

خنساء کا شعر ہے:

نھین النفوس وھون النفو س عند الشدائد ابقی لھا

(ہم مصائب کے وقت اپنی جانوں کو نہایت حقیر سمجھتے ہیں، اور ایسے اوقات میں ان کو حقیر سمجھنا ہی ان کی اصل زندگی ہے)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک نفس کا شرف یہ ہے کہ وہ مصائب کو جھیلے اور ناگوار کو گوارا کرے۔ یہی انسان کی اصلی آزمائش ہے۔ ابولہب اس آزمائش میں ناکام رہا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے مشتعل اور مغرور نفس کی اصلاح کرتا اس نے اپنی حرص و طمع اور حسد و عداوت کی آگ اور زیادہ بھڑکا دی۔

یہ جو ہم نے ابولہب کے حسد و عداوت اور اس کی حرص و طمع کو آگ سے تعبیر کیا ہے تو یہ محض ہماری خیال آرائی نہیں ہے بلکہ عرب و عجم سب ان بری عادتوں کو آگ ہی سے تشبیہ دیتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان عادتوں کو آگ سے کوئی حسی مناسبت نہیں ہے۔ اس وجہ سے لازماً یہ تشبیہ ان کے اثر کو پیش نظر رکھ کر ہی اختیار کی گئی ہوگی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشابہت عام عقل انسانی کے نزدیک نہایت واضح ہے۔

قرآن مجید میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ وہ عموماً عذاب و ثواب کو ایسی صورت میں بیان کرتا ہے جس کو اعمال سے مناسبت ہوتی ہے۔ اس سے بعض اہم حقائق کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے۔ جو لوگ اس پہلو سے قرآن مجید پر غور کریں گے ان پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ شہوات اور ان کے اثر کو آگ سے بہت زیادہ مشابہت ہے۔ اس حقیقت کے واضح ہونے کے بعد ہم میں یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ جزا در حقیقت عمل ہی کا حاصل اور اسی کا ثمرہ ہے۔ اس سے کمال عدل الٰہی پر ہمارا ایمان پختہ ہوتا ہے اور اسمائے الٰہی میں سے الحق المبین اور خیر الحاکمین کی معرفت بڑھتی ہے اور یہ یقین مستحکم ہو جاتا ہے۔ کہ خداوند تعالیٰ بندوں پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۱۰-۴۴)	اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا بلکہ خود اپنے اوپر ظلم ڈھاتے ہیں۔

اس آیت پر اگر ہم جزا اور عمل کی مشابہت کے پہلو سے غور کریں گے تو اس سے ہمارے گزشتہ مباحث کی تائید ہوگی اور ابولہب کے اعمال اور اس کے حالات کی مطابقت بالکل واضح ہو جائے گی۔ پس ہمارے نزدیک سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (جلد بھڑکتی آگ میں پڑے گا) ایک ایسے واقعہ کی خبر ہے جو حرف بحرف پورا ہوگا اور جس سے کسی حال میں بھی مفر نہیں۔

۱۰۔ چوتھی آیت کی تاویل

چوتھی آیت کا مطلب یہ ہے کہ ابولہب کی بیوی بھڑکتی آگ میں پڑے گی اور اس وقت اس کی حالت ایندھن ڈھونے والی لونڈی کی سی ہوگی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ دنیا میں ایندھن ڈھوتی تھی۔ یہ تاویل نہ صرف بعید بلکہ بالکل غلط ہے۔ دلائل کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ لفظ حمالۃ منصوب ہے۔ تمام امت اس قرأت پر متفق ہے۔ قرآن کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ متواتر اور محفوظ قرادت کے ہوتے ہوئے شاذ قرأت اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ ہم قرادت کے اختلاف کے منکر نہیں ہیں۔ بشرطیکہ یہ اختلاف معانی کے اختلاف تک نہ پہنچ جائے۔ اہل قرأت جو مختلف قرأتیں بیان کرتے ہیں اس سے ان کا مقصود تفسیر اور اصل مطلب کو مخاطب کے ذہن سے قریب تر کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے حمالۃ کو رفع کے ساتھ بھی پڑھا ہے لیکن وہ ایک دوسرے طریقہ سے وہی مطلب سمجھانا چاہتے ہیں جو نصب والی قرأت سے مقصود ہے۔ ہم یہاں دونوں طریقوں سے اس کی تفسیر کرتے ہیں۔

نصب والی قرادت کی صورت میں وَامْرَاَتُهٗ میں جو 'و' ہے وہ عطف کے لیے ہے۔ یعنی اس کی بیوی اپنے شوہر کے ساتھ بھڑکتی آگ میں پڑے گی۔ یہ مطلب بالکل واضح ہے۔ سیاق کلام اسی کا مقتضی ہے۔ یہاں دونوں کا آگ میں داخل ہونا بیان کیا گیا ہے، اور نص سے جو مفہوم واضح ہوتا ہو اسی کو اختیار کرنا بہتر ہے۔ اس صورت میں حمالۃ کا نصب حالیت کی وجہ سے ہوگا۔

سیبویہ نے لکھا ہے کہ:

بلغنا ان بعضهم قرأ هذا الحرف نصبا وامرأته حمالة الحطب ولكنه كانه قال اذكر حمالة الحطب شتما لها۔	بعض لوگوں نے "حمالۃ الحطب" کو منصوب پڑھا ہے۔ ان لوگوں نے گویا ذم وشتم کے لیے لفظ 'اذکر' مقدر مانا ہے۔

سیبویہؒ کے نزدیک مختار قرادت رفع کی ہے۔ لیکن جو لوگ منصوب پڑھتے ہیں ان کا مقصود سیبویہؒ کے خیال میں گویا یہ ہوگا۔ حالانکہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ہم آگے بتائیں گے کہ رفع والی قراءت کی صورت میں آیت کی تاویل کیا ہوگی۔

صاحب کشاف نے بھی اسی مذہب کو اختیار کیا ہے لیکن یہ سیبویہ کے قریب ہیں آگئے ہیں۔ ان کی طبیعت بہت نادر پسند ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا ذوق بھی قابل اعتماد نہیں ہے۔ اس تاویل کو انھوں نے محض اس وجہ سے اختیار کر لیا ہے کہ اس میں مذمت اور ہجو کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

وانا استحب هذه القراءة وقد توسل الى رسول الله صلى الله عليه وسلم بالجميل من احب شتم ام جميل۔	میں اس قرادت کو ترجیح دیتا ہوں اور جس نے ام جمیل (ابولہب کی بیوی) کو گالی دینا پسند کیا اس نے رسول اللہ تک نیک عمل کا وسیلہ پیدا کیا۔

اس سادگی کو دیکھو، ایک فضول اور مہمل قول کو محض ایک لفظی صنعت اور ضلع جگت کی خاطر اختیار کر لیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ قول ذرا بھی لائق توجہ نہیں۔

ہم چھٹی فصل میں دلائل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ یہاں مذمت اور ہجو کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اگلی سطروں میں یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ اس کی حالیت کی وجہ سے منصوب ہونا موقع اور نظم کے لحاظ سے بہتر اور تاویل کے اعتبار سے خوبصورت ہے۔ اس لیے کچھ ضروری نہیں کہ اعراب کا ایک نادر پہلو پیدا کیا جائے۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ میں يَصْلٰى کا جو فاعل ہے حمالۃ اسی سے حال پڑا ہوا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ یہ حالت اس کی اس وقت ہوگی جب وہ بھڑکتی آگ میں پڑے گی۔

رفع والی قرأت کی شکل میں "حَمَّالَةُ" "وَامْرَاَتُهٗ" کی خبر پڑے گا، جیسا کہ سیبویہ کے قول سے مفہوم ہوتا ہے اور 'و' اس صورت میں حالیہ ہوگا۔ یعنی "ابولہب بھڑکتی آگ میں پڑے گا اور حال یہ ہوگا کہ اس کی بیوی ایندھن ڈھونے والی ہوگی اور اس کے گلے میں بٹی ہوئی رسی پڑی ہوگی۔" پس جو لوگ حمالۃ کو رفع کے ساتھ پڑھتے ہیں وہ بھی درحقیقت اسی مفہوم کی تفسیر کرتے ہیں جو نصب والی قرادت میں ہے تاکہ کسی کو ہجو اور مذمت کا گمان نہ ہو۔

اس صورت میں 'و' کا عطف کے لیے ہونا بوجوہ ذیل صحیح نہیں ہو سکتا۔

الف۔ یہ حالت اس کی دنیا میں نہیں تھی۔ تفصیل اس کی بعد میں آئے گی۔

ب۔ معطوف اور معطوف علیہ میں بعد ہو جائے گا۔

ج۔ دونوں خبروں "حَمَّالَةَ الْحَطَبِ" اور "فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ" کا نظم درہم برہم ہو جائے گا۔ اس کو صفت قرار دے کر رفع پڑھنے کی بھی کوئی شکل نہیں ہے کیونکہ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ نکرہ ہے۔ اس میں اسم مبالغہ اپنے معمول کی طرف مضاف ہو گیا ہے۔ یہ بہر صورت اضافت لفظی ہے جو مضاف کو معرفہ نہیں بنا سکتی۔

مبتدا کو محذوف قرار دے کر اس کو خبر پڑھنا یعنی هِيَ حَمَّالَةُ الْحَطَبِ سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ حذف خلاف اصل ہے۔ نیز اس شکل میں بھی یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ یہ اس کی دنیا کی حالت کا بیان ہے اس وجہ سے بات ویسی ہی مبہم رہ گئی جیسی پہلے تھی۔ غرض دونوں قرادتوں کا ماحصل یہی ہے کہ یہ اس کی آخرت کی حالت کا بیان ہے۔

۲۔ بعد والی آیت میں جیسا کہ ظاہر ہے اس کی روز قیامت کی حالت کا بیان ہوا ہے۔ اس بات پر تمام مفسرین متفق ہیں۔ اس میں درحقیقت اسی وصف کو پورا کیا گیا ہے جو حَمَّالَةَ الْحَطَبِ میں مذکور ہے، جیسا کہ آگے چل کر آیت کی تاویل سے واضح ہوگا۔

اس وجہ سے لازمی طور پر ان دونوں کو ایک ہی زمانہ میں ماننا پڑے گا۔

ایک شاعر کہتا ہے:

امشی الی اللهیجا مصبحا متقلدا سیفا و رمحا

(میں صبح کو لڑائی کے لیے نکلتا ہوں، تلوار اور نیزہ لے کر)

اس میں دونوں حالتوں کو دو زمانوں میں نہیں قرار دے سکتے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ قریش کا رتبہ اس سے بہت برتر تھا کہ ان کی عورتیں لکڑیاں اور ایندھن ڈھوئیں۔ جن کو عرب کی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت ہے، وہ جانتے ہیں کہ عرب کی عنانِ حکومت قریش کے ہاتھ میں تھی۔ خصوصاً بنی ہاشم تو گویا سارے عرب کے سرتاج تھے۔ ان کی عزت اور ان کی شان کا یہ حال تھا کہ یہ اپنے بچوں کو دودھ پلانے کے لیے دوسرے قبیلوں کی دائیاں رکھتے تھے۔ کیونکہ یہ کام تکلیف دہ ہونے کے علاوہ ان کی عورتوں کے خلافِ شان تھا۔ کیا ان کے متعلق یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ان کی بیگمات ایندھن ڈھونے کا کام کریں گی۔ جو صرف لونڈیوں کے کرنے کا کام سمجھا جاتا تھا۔

چنانچہ نابغہ کہتا ہے:

تحید عن استن سود اسافلہ مشی الاماء الغوادی تحمل الخزما

(وہ اونٹنی اَستن کے ان درختوں سے بدکتی ہے جن کے تنے سیاہ ہیں اور جوان لونڈیوں کی طرح چلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جو صبح کے وقت لکڑیوں کے گٹھے لے کر نکلتی ہیں)

مہلہل کا شعر ہے:

لم ادع غیر اکلب و نساء و اماء حواطب و عیال

(میں نے قبیلہ بنی بکر میں) بھونکنے والے کتوں، ماتم کرنے والی عورتوں، ایندھن ڈھونے والی لونڈیوں اور بچوں کے سوا کسی کو نہ چھوڑا)

اصاب صریح القوم غرب سیوفنا و غادرن ابناء الاماء الحواطب

(ہماری تلواروں نے حریفوں کے تمام شرفا کا خاتمہ کر دیا۔ صرف ایندھن ڈھونے والی لونڈیوں کی اولادیں بچ رہی ہیں)

اخنس بن شہاب تغلبی لکھتا ہے:

یظل بہا ربد النعام کانہا اماء تزجی بالعشی حواطب

(ان منزلوں میں خاکی رنگ کے شتر مرغ ایسے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جیسے شام کو ایندھن ڈھونے والی لونڈیاں تھکی ماندی واپس آتی ہیں)

چنانچہ بعض لوگوں نے اسی استبعاد کی وجہ سے ایک دوسرا مذہب اختیار کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ابولہب کی بیوی چغل خور تھی، اور اس کی اسی بری عادت کو حَمَّالَةَ الْحَطَبِ سے بطریقِ کنایہ ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ یہ عرب کے ایک شریف ترین خاندان کی عورت ہے۔ یہ ام جمیل بنت حرب، خاندان بنی عبد شمس کی ایک باعزت خاتون ہے جو ہاشمی خاندان میں بیاہی گئی ہے۔ یہ ایندھن ڈھونے والی لونڈی نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے انھوں نے تاویل کا ایک دوسرا پہلو اختیار کیا۔ لیکن جب کلام کو حسن تاویل کے ساتھ ظاہر پر محمول کرنا ممکن ہو تو مجازی معنی لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

پھر یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید کی تاویل میں قدیم کلام عرب کی پیروی کی جائے اور ان کے قدیم کلام کا جو حصہ ہمارے پاس محفوظ ہے اس کے پورے دفتر میں اس مجاز کی ایک مثال بھی موجود نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے ابن الاسلت کے اس شعر سے استدلال کیا ہے۔

وتبنتکم شرجین کل قبیلۃ لها زمل من بین منذ و حاطب

لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے، عرب لڑائی کی آگ بھڑکانے کے لیے چغلی کا ذکر نہیں کرتے بلکہ ایسے مواقع پر اسلحہ، گھوڑوں اور شہ سواروں کا ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ بشامہ بن عمرو مری لکھتا ہے۔

وحشوا الحروب اذا اوقدت رماحا طوالا وخیلا فحولا

ومن نسج داؤد موضونۃ تری للقواطب فیها صلیلا

(جب لڑائی کی آگ بھڑکائی جائے تو اس کے لیے نیزے اور سورما شہ سواروں کا ایندھن فراہم کرو، اور داؤدی بناوٹ کی ملی ہوئی کڑیوں والی زرہیں جن پر تلواروں کے پڑنے سے جھنکار سنائی دے)

عمرو بن اطنابہ خزرجی کہتا ہے:

لیسوا بانکاس ولا میل اذا ما الحرب شبت اشعلوا بالشاعل

(وہ کمینے اور بودے نہیں ہیں، جب لڑائی کی آگ بھڑکتی ہے تو اس کو بھڑکانے والے نوجوانوں کے ذریعہ تیز کر دیتے ہیں)

اس مجاز کی تائید میں صاحبِ لسان العرب نے بھی ایک شعر نقل کیا ہے۔

من البیض لم تصطد علی ظہر لامۃ ولم تمش بین الحی بالحطب الرطب

(وہ گوری چٹی ہے، کبھی کسی قابلِ الزام کام میں پکڑی نہیں گئی اور قبیلہ میں چغل خوری اس کا شیوہ نہیں)

لیکن یہ استدلال بھی چنداں قابلِ اعتناء نہیں ہے۔ اولاً تو صاحب لسان العرب نے شاعر کا نام نہیں بتایا ہے اور ایک مجہول شاعر کی سند خصوصاً تاویل قرآن میں کسی طرح مفید نہیں ہو سکتی۔ اس اصول پر تمام علماء نے اتفاق کیا ہے۔ ثانیاً شعر میں یہ استعارہ قرینہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے جس کے بغیر یہ مفہوم نہیں سمجھا جا سکتا۔

اس طرح بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہؓ کے راستہ میں کانٹے بچھاتی تھی، اس وجہ سے اس کو "حَمَّالَةَ الْحَطَبِ" کہا گیا۔ ابن جریر کا یہی مذہب ہے۔ لیکن یہ تاویل بھی بہت بعید از قیاس ہے۔ راستہ میں کانٹے بچھانے والے کو "حامل الحطب" کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے، نیز راستہ کے کانٹوں سے ہر شخص کو اذیت پہنچے گی۔ یہ صرف آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہ ہی کے لیے تو خاص نہیں ہو سکتے۔

۴۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ ایندھن ڈھونا مذہبی نقطۂ نظر سے کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ پھر قرآن مجید نے اس کا عیب کی حیثیت سے کیوں ذکر کیا؟ یہ بات قرآن مجید کی شان سے نہایت بعید ہے کہ وہ ایک ایسی چیز کا ذکر عیب کی حیثیت سے کرے جس میں کوئی اخلاقی برائی نہیں ہے۔ اس نے دشمنانِ خدا کے بہت سے عیوب کا تذکرہ کیا ہے، لیکن یہ وہی باتیں ہیں جو عقل و تقویٰ کے اعتبار سے عیب ہیں۔ صرف ایک جگہ سورہ ن میں قریش کے ایک لیڈر کے متعلق "زنیم" (خارجی) کا لفظ استعمال کیا ہے، لیکن

جیساکہ اس آیت کی تفسیر میں ہم تفصیل سے تبلا چکے ہیں۔ اس سے محض اس کی تملق اور چاپلوسی کی عادت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔
یہ دلائل ہم نے بطور تمہید کے اس لیے بیان کیے ہیں کہ اس آیت میں جس حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور جس کا ذکر ہم آگے کرنے والے ہیں، وہ ان شکوک میں کہیں گم نہ ہو جائے، استدلال کے لیے سب سے زیادہ قابل اعتماد چیز معنی اور نظم کے حسن کا لحاظ ہے۔

۱۱۔ ابولہب کی بیوی کا ذکر کیوں کیا گیا؟

چھٹی فصل میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ کسی خاص عورت کو، اس بناء پر کہ اس نے پیغمبر عالم صلعم اور آپ کے صحابہؓ کو ایذا دی ہے، گالی دینے اور مذمت کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگر قرآن مجید گالی دینے پر اتر آتا، حالانکہ وہ اس سے پاک ہے، تو اس کی گالی اور مذمت کی سب سے زیادہ مستحق وہ یہودیہ تھی جس نے آنحضرت صلعم کے کھانے میں زہر ملایا تھا۔ جن ظالموں نے نہایت بے دردی کے ساتھ آپؐ کو طائف سے نکالا، آپؐ نے ان کی بھی بجز اپنے پروردگار کے، کسی سے شکایت نہیں کی اور یہ شکایت بھی جن الفاظ میں فرمائی ہے ان کی شیرینی اور لطافت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کا شب و روز کا مشغلہ ہی ذات رسالت کی توہین تھا، اس لیے وہ سب سے زیادہ ہجو اور مذمت کے مستحق تھے۔ لیکن شیریں کلامی اللہ اور اس کے رسول کو ہر چیز سے زیادہ محبوب ہے۔ اب غور کرو کہ جب قرآن نے ان مردوں میں سے کسی کو گالی نہیں دی تو ان کی عورتوں میں سے کسی کو گالی دینے کو کب روا دار ہو سکتا ہے؟ بہر حال یہ خیال نہایت مہمل ہے۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ اب اصل مسئلہ پر غور کرنا چاہیے کہ اس عورت کے ذکر کرنے میں کیا خاص حکمت ہے؟ خدا نے قرآن کو کتاب حکیم کہا ہے، پس انسان کی اصل طلب و جستجو یہ ہونی چاہیے کہ اس میں حکمت تلاش کرے۔

خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں بعض قوموں اور بعض افراد کا ذکر شر و خیر کی مثال کی حیثیت سے کیا ہے کہ ان کو خدا کی جو نعمت و نقمت پہنچی ہے ہم اس سے عبرت حاصل کریں۔ اس سلسلہ میں جس طرح اس نے بعض مردوں کا ذکر کیا ہے، اسی طرح بعض عورتوں کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے وجوہ یہ ہیں۔

۱۔ ہم جنس ہم جنس کے واقعات و حالات سے عبرت حاصل کرتا ہے۔

۲۔ بعض اخلاقی معائب و محاسن مردوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور بعض عورتوں کی خصوصیات میں سے ہیں۔ اس وجہ سے تبلیغ و دعوت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہوا کہ دونوں صنفوں کا تذکرہ کیا جائے۔

۳۔ عورتوں کے واقعات بیان کر کے خداوند تعالیٰ نے ان کی اہمیت آشکارا کر دی کہ وہ کس حد تک مردوں کی سعادت و شقاوت کا ذریعہ بن سکتی ہیں، کیونکہ ان کے خصائل و عادات، ان کے شوہروں اور بچوں پر بہت بڑی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ جو لوگ قوموں کی تاریخ پر غور کرتے ہیں، وہ جب بعض اہم واقعات کے اسباب و علل کے سراغ میں نکلتے ہیں تو بسا اوقات ان کا آخری سرا کسی پردہ نشین کی نازک انگلیوں میں پاتے ہیں۔ اس وجہ سے اگر قرآن ان کا ذکر نہ کرتا تو فلسفۂ معاشرت و سیاست کا ایک عظیم الشان باب ہماری نگاہوں سے مخفی رہ جاتا۔

جو شخص قرآن مجید کے امثال پر غور کرے گا اور اخلاق و عادات کے خصوصیات و اثرات اور ان کے نفع و ضرر کے

مدارج پر حکیمانہ نظر ڈالے گا اس کو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ عورتوں کی بعض عادتوں کے برے اثرات، ان کے شوہروں تک متعدی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً عورتوں کی طبیعت میں بخل اور ساتھ ہی ان میں زینت و آرائش کا شوق غیر معمولی ہوتا ہے۔ یہ چیز ان کے شوہروں کو آمادہ کرتی ہے کہ جس ذریعہ سے بھی ممکن ہو ان کے لیے دولت حاصل کریں اور اس دولت کو ادائے حقوق اور اعانت مستحقین کی جگہ، ان کے جسموں پر لاد دیں۔ اس طرح جو مال بقائے حیات کی بنیاد اور حصول نجات کا ذریعہ ہے، بدبودار پانی کی طرح ایک ہی جگہ بند ہو جاتا ہے، جس سے اس کی مضرتیں بڑھنے اور پھیلنے لگ جاتی ہیں اور فوائد مفقود ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کی ازواج مطہرات کو دنیا کی زینت سے نفرت دلائی ہے اور اس چیز کی خرابیاں جس تفصیل سے بیان کی ہیں کوئی دوسری چیز اس تفصیل سے نہیں بیان کی، یہاں تک کہ اس کو جاہلیت کی یادگار اور نجاست سے تعبیر کیا۔

عورتوں کی زر پرستی کی علت صرف زینت و آرائش کا شوق ہی نہیں ہے بلکہ بخل ان کی فطرت کا ایک مستقل عنصر ہے۔ اسی وجہ سے وہ عموماً اپنے شوہروں کو فیاضی اور سخاوت سے روکتی رہتی ہیں۔ قرآن مجید نے متعدد جگہ اس راز کو آشکارا کیا ہے۔ اور مردوں کو متنبہ کیا ہے کہ جب وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکیں تو وہ ان کی بات پر کان نہ دھریں لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم کو یہ ہدایت بھی کی ہے کہ ان کے معاملہ میں ہم عفو و درگزر سے کام لیں۔ جو لکڑی سیدھی نہیں ہوتی ضرور نہیں کہ توڑ ہی دی جائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ وَإِن تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔ (۶۴-۱۴)

اے ایمان والو تمہاری بیویوں اور بچوں میں تمہارے دشمن ہیں (یہاں ازواج کے ساتھ اولاد کو بھی شامل کر لیا۔ کیونکہ ان کی محبت بھی آدمی کو بخل پر آمادہ کرتی ہے چنانچہ آنحضرت صلعم نے فرمایا الولد مبخلة مجبنة اولاد آدمی کے لیے بخل اور بزدلی کا سبب بنتی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ زبان سے کہہ کر بخل پر آمادہ کرتے ہیں) پس ان سے بچو (یعنی اس شر سے جو ان کی وجہ سے تم کو پہنچ سکتا ہے) اور اگر تم معاف کرو گے درگزر کرو گے اور بخشو گے تو اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنفِقُوا خَيْرًا لِّأَنفُسِكُمْ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۶۴-۱۶)

پس اللہ سے جہاں تک ڈر سکتے ہو ڈرو اور سنو اور اطاعت کرو اور اپنے لیے خدا کی راہ میں خرچ کرو اور جنھوں نے بخل سے نجات پائی وہی فلاح پانے والے ہیں۔

عربی شعراء فیاضی پر عورتوں کی ملامت کا بہت تذکرہ کرتے ہیں۔ مثلاً حاتم طائی کہتا ہے۔

وعاذلة هبت بليل تلومنی　　وقد غاب عيوق الثريا فعردا

(اور کتنی ملامت کرنے والی عورتیں، رات میں مجھے ملامت کرتی ہوئی اٹھتی ہیں اور حال یہ ہے کہ عیوق ثریا غائب ہو چکا ہے۔ (یعنی جاڑے کے زمانے میں)

تلوم علی اعطائی المال ضلة　　اذا ضن بالمال البخيل وصردا

وہ میری فیاضی پر عبث ملامت کرتی ہیں، ایسے زمانہ میں جب کہ بخیل اپنے مال کو بچا کر رکھتا ہے اور تھوڑا تھوڑا خرچ کرتا ہے۔
(یعنی قحط کے زمانہ میں)

تقول الا امسک علیک فاننی — اری المال عند الممسکین معبدا

(وہ کہتی ہے اپنا مال اپنے لیے بچا رکھو کیونکہ اس زمانہ میں بخیل کو اپنا مال بہت عزیز ہوتا ہے

ذرینی یکن مالی لعرضی جنۃ — نقی المال عرضی قبل ان یتبددا

(میں جواب دیتا ہوں کہ مجھے بخشو کہ میرا مال میری آبرو کے لیے سپر بن سکے۔ وہ تقسیم ہونے سے پہلے ہی میری آبرو کو بچا سکتا ہے)

یہی شاعر کہتا ہے:

وعاذلتین ھبتا بعد ھجعۃ — تلومان متلافا مفیدا ملوما

(اور وہ ملامت کرنے والی عورتیں ایک ایسے نوجوان کو ملامت کرتی ہوئی اٹھیں جو دریادل اور صاحب فیض ہے اور اپنی فیاضیوں کی وجہ سے ہمیشہ ہدف ملامت بنا رہتا ہے)

تلومان لما غور النجم ضلۃ — فتی لایری الاتلاف فی الحمد مغرما

(وہ ایسے زمانے میں جب کہ ثریا ڈوب گئی ہے (یعنی جاڑے کے زمانے میں) ایک ایسے نوجوان کو عبث ملامت کرتی ہیں جو مستحق ستائش کاموں میں خرچ کرنا تاوان نہیں خیال کرتا)

عورت کی اس فطرت کو نگاہ میں رکھو۔

تیسری فصل میں گزر چکا ہے کہ ابولہب کی دولت اچھی راہ سے نہیں آئی تھی۔ اس کی زرپرستی اور طمع مال نے اس کو نہایت سخت اخلاقی جرائم کا مرتکب بنایا۔ اس کے لیے اس نے اللہ سے خیانت کی۔ رشتۂ رحم کو توڑا۔ پیغمبر سے دشمنی کی اور اسی عداوت کی آگ میں جل کر مر گیا۔ جو شخص ان باتوں کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ پر غور کرے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے عذاب میں اس کی بیوی کو شریک کیا، اس کو اس بات میں شک نہ رہے گا کہ اس عذاب کے اسباب پیدا کرنے میں وہ بھی برابر کی شریک تھی۔ اسی نے اپنے شوہر کو مجبور کیا کہ وہ حرام و حلال، جس راہ سے ممکن ہو، اس کی زینت و آرائش کا سامان فراہم کرے تاکہ ہم چشموں میں اس کی گردن بلند رہے۔ اس کے لیے وہ ادائے حقوق میں مانع ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی شریک عذاب قرار دی گئی۔ اللہ تعالیٰ کسی کو کسی کا شریک اس وقت تک نہیں بناتا جب تک وہ اس کے عمل میں اس کا شریک نہ ہو۔ اس کے علاوہ قرآن نے اس کی جو حالت بیان کی ہے وہ بھی اسی تاویل کی تائید کرتی ہے۔ اور اس بات کو کھولتی ہے کہ درحقیقت اسی نے ابولہب کو ان جرائم پر آمادہ کیا۔ تفصیل اگلی فصل میں آئے گی۔

ان وجوہ سے اللہ تعالیٰ نے جس طرح ابولہب کو مردوں کے لیے نمونۂ عبرت قرار دیا، اسی طرح اس کی بیوی کو عورتوں کے لیے مثال ٹھہرایا کہ عالم انسانی کے دونوں طبقے بخل اور شوق زینت کے برے نتائج سے آگاہ ہو جائیں اور لوگ اپنی بیویوں سے خبردار رہیں کہ وہ کہیں ادائے حقوق اور انفاق فی سبیل اللہ سے روک کر ان کے لیے فتنہ نہ بن جائیں۔ اس سے ہم کو یہ سبق بھی ملتا ہے کہ بخل کوئی معمولی برائی نہیں ہے، بلکہ یہ بے شمار برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ یہ زکوٰۃ کا عین ضد ہے جو تمام اعمال صالحہ کا نصف ہے، قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے۔

وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۶۴-۱۶) ۔ جو بخل سے محفوظ رہے، انہی نے فلاح پائی۔

قرآن پاک میں متعدد سورتیں صرف بخل کی مذمت کے لیے مخصوص کی گئیں۔ مثلاً سورہ تطفیف، سورہ تکاثر، سورۂ ہمزہ، حالانکہ خالص توحید کے مضمون کے لیے صرف ایک ہی سورہ مخصوص کی گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بخل کس قدر خوفناک برائی ہے اور عورتوں کا شوق زینت اور ادائے حقوق سے مانع ہونا کتنا بڑا فتنہ ہے؛ اس نصیحت کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے بہت سے لوگ عورتوں کی اس عادت کو مفید مصلحت خیال کرتے ہیں۔

۱۲۔ لفظ حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ کی حکمت اور جزا و عمل کی مشابہت

قرآن مجید میں مغرور امراء اور متکبر دولت مندوں کے لیے ذلت و اہانت کا عذاب بیان کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہی چیز ان کے لیے سب سے زیادہ دردانگیز ہے۔ ایک حماسی شاعر کہتا ہے۔

بضرب فیہ توھین — وتخضیع واقران

(ہم نے ان کو ایسی مار ماری جو توہین، ذلت اور تسخیر سب کا مجموعہ تھی)

عرب میں مثل ہے کہ "النار ولا العار" (آگ میں جل جانا گوارا ہے مگر ذلت نہیں) خداوند تعالیٰ نے ان کو خبر دی کہ تمہارے لیے آگ اور ذلت دونوں ہیں۔

فَالْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْھُوْنِ بِمَا کُنْتُمْ تَسْتَکْبِرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَبِمَا کُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ (۴۶-۲۰)

آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا کیونکہ تم زمین میں ناحق متکبر تھے اور خدا کے حکموں سے سرتابی کرتے تھے۔

دوسری جگہ فرمایا:

سَنَسِمُہٗ عَلَی الْخُرْطُوْمِ (۶۸-۱۶)

ہم عنقریب ان کے نتھنے پر داغ لگائیں گے۔

ایک جگہ فرمایا:

ذُقْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ

(خدا کا عذاب) چکھو، تم دنیا میں غالب اور باعزت تھے۔

اسی طرح عموماً جزا کو عمل کے مناسب بیان کیا گیا ہے تاکہ جزا کا عدل ہونا بالکل واضح ہو جائے۔

ہم آٹھویں فصل میں بیان کر چکے ہیں کہ زرپرستی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت کے جوش نے ابولہب کو بالکل مشتعل آگ بنا دیا تھا۔ نیز دسویں فصل میں گزر چکا ہے کہ چونکہ اس کی بیوی ہی نے زینت و آرائش اور زیوروں کے شوق میں اس کو ان جرائم پر آمادہ کیا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی شریک عذاب قرار دیا۔ چنانچہ فرمایا سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَھَبٍ وَّامْرَاَتُہٗ (اور وہ جلد بھڑکتی آگ میں پڑے گا اور اس کی بیوی بھی) اور اس کی حالت "حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ" کے لفظ سے بیان کی جس میں جزا اور عمل کی مشابہت کے بہت سے پہلو ہیں۔ جن میں بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

۱۔ اس کو دنیا میں جو عزت اور شان حاصل تھی، آخرت میں اس سے محروم ہو کر وہ ذلت و خواری میں مبتلا ہو گی۔

۲۔ وہ جن قیمتی زیوروں پر فخر کرتی تھی، وہ خود اس کے جلانے کے لیے ایندھن بن جائیں گے۔ ان دنیوی زخارف کی حقیقت ایندھن سے بہت مشابہ ہے۔ گویا قیامت کے دن اس کی حالت اس شخص کی ہو گی جو اپنی سولی کا تختہ اور اپنے جلانے کے لیے

ایندھن خود اپنے سر پر اٹھائے ہوئے ہو۔ یہی حقیقت اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔

وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ ۚ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ (۶-۳۱) — وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر لادے ہوئے ہوں گے اور آگاہ! یہ برا بوجھ ہوگا۔

۳۔ اسی نے ابولہب کی خباثتِ نفس کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکایا اس لیے گویا وہی اس کی آگ کے لیے ایندھن فراہم کرنے والی بنی۔ پس دنیا میں اس کے اس عمل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن ایندھن ڈھونے والی لونڈی کی صورت میں اٹھائی جائے۔ اس کے متعلق حضرت سعید بن جبیرؓ سے ایک روایت ہے جو ہمارے قول سے بہت ملتی جلتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں "حطب" سے وہ گناہ مراد ہیں جن کی وہ رسول اللہ صلعم کی عداوت میں مرتکب ہوئی کیونکہ وہ اس کو آگ میں جلانے کے لیے بمنزلہ ایندھن کے ہیں۔

۴۔ آگے گزر چکا ہے کہ ابولہب کی سزا اس کی حالت کے بالکل مناسب بیان کی گئی ہے۔ یہی مناسبت اس کی بیوی کی سزا میں بھی ملحوظ ہے۔

۵۔ صرف "حَمَّالَةَ الْحَطَبِ" کہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پانچویں آیت میں ایندھن ڈھونے والی لونڈی کی تصویر کھینچ دی تفصیل آگے آتی ہے۔

۱۳۔ پانچویں آیت کی تاویل اور ماقبل سے اس کا تعلق

چونکہ فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ (اور اس کی گردن میں بٹی ہوئی رسی پڑی ہوگی) میں اس کی قیامت کی حالت کا بیان ہے، اس وجہ سے بعض اہل تاویل نے "حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ" سے وہی چیز مراد لی ہے جس کا ذکر قرآن پاک نے کفار کے حالات کے سلسلہ میں سورۂ حاقہ کی اس آیت میں کیا ہے۔

فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ (۶۹-۳۲) — ایک زنجیر میں جس کا طول ستر گز ہے اس کو جکڑ دو۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں نے لفظ "مسد" کے معنی بدل دیے ہیں بلکہ اس کی تاویل انھوں نے ان عام معذبین کے مشابہ کر دی ہے جن کا بیان قرآن مجید میں ہوا ہے۔ حالانکہ لفظ کو بغیر ضرورت اس کے ظاہری معنی سے ہٹانا جائز نہیں ہے۔ اسی وجہ سے دوسرے لوگوں نے اس کی تفسیر حقیقی معنی ہی کے اعتبار سے کی ہے۔ کیونکہ یہ لفظ عربی زبان میں مشہور ہے، اس کے اسم و فعل سب عام طور پر مستعمل ہیں۔

لغت میں "مسد" کا لفظ کھجور کے اس ریشے یا پتی یا چھلکے کے لیے بولا جاتا ہے جس سے مضبوط رسیاں بٹی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لفظ عام طور پر مضبوط اور موٹی رسی کے لیے بھی مستعمل ہے خواہ وہ کھجور کے ریشہ کی ہو یا چمڑے کی یا اسی قسم سے کسی اور چیز کی۔ چرخی کی رسی کے لیے اس کا استعمال عام ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لفظ موٹی اور مضبوط رسی کے معنی میں عام ہے۔ "مسد الحبل" کے معنی ہیں رسی کو خوب مضبوط بٹنا۔ پس ظاہر تاویل یہ ہوگی کہ جب وہ قیامت کے دن اٹھے گی تو اس کی گردن میں ایک مضبوط رسی پڑی ہوگی جو ایندھن ڈھونے والی لونڈیوں کی گردن میں پڑی ہوئی رسی سے زیادہ موٹی ہوگی۔

اب آئیے غور کیجیے کہ اس صفت کے اضافہ سے کیا نئے حقائق روشنی میں آتے ہیں۔

۱۔ اس میں ابولہب کی بیوی کی اس حالت کی توضیح ہے جو لفظ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ میں بیان ہوئی ہے۔

۲۔ ب۔ اس میں اس ذلت کی تصویر ہے جس میں بالآخر وہ قیامت کے دن گرفتار ہوگی۔

۳۔ ج۔ اس میں عمل اور نتائج عمل کی موافقت کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ جس ہار کو پہن کر وہ دنیا میں اتراتی تھی وہ قیامت کے دن موٹی رسی کی شکل میں بدل جائے گا جس کی وجہ سے اس کی شال اس لونڈی کی ہو جائے گی جو گلے میں رسی ڈال کر لکڑیاں چننے جا رہی ہو۔

۴۔ متکبر عورتیں محض آرائش پر قناعت نہیں کیا کرتی ہیں بلکہ سامانِ آرائش کے حجم اور وزن کا بھی خیال رکھتی ہیں اس مناسبت سے ضروری ہوا کہ رسی موٹی ہو۔

عربی زبان میں گردن کے لیے عنق کا لفظ بھی مستعمل ہے۔ لیکن یہاں قرآن نے جید کا لفظ استعمال کیا ہے، اس سے بھی مذکورہ اشارات کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ جید کا لفظ عام طور پر اچھے مواقع یعنی اظہارِ فخر و تمکنت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً امراء القیس کہتا ہے:

وجید کجید الریم لیس بفاحش　　اذا ھی نصتہ ولا بمعطل

(اور اس کی گردن ہرن کی گردن کی طرح تھی لیکن جب وہ اس کو اٹھاتی تھی تو اس کی درازی غیر معتدل نہ تھی اور نہ زیورات سے خالی تھی)

امراء القیس ہی کے ایک شعر کا مصرع ہے۔

بجید معم فی العشیرۃ مخول

(ان کی گردنیں ایک باعزت آدمی کی طرح اونچی تھیں جس کے ماموں اور چچا اپنے بھائی بندوں میں باوقار ہوں)

اگر اس موقع پر مذکورہ بالا حقائق کی طرف اشارہ کرنا مقصود نہ ہوتا تو توہین و تذلیل کے موقع اور موٹی رسی کی مناسبت سے یہاں "جید" کے مقابل میں عنق کا لفظ زیادہ موزوں ہوتا۔ قرآن مجید میں ایسے واقع پر "عنق" ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے مثلاً۔

فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ (۲۶-۴) — پس ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں۔

دوسری جگہ ہے:

إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا (۳۶-۸) — ہم نے ان کی گردنوں میں بھاری طوق ڈال دیے ہیں۔

اگر یہاں یہ توضیح و تصویر اور تنبیہ مقصود نہ ہوتی جس کا ہم نے ذکر کیا ہے تو اس کی گردن میں بٹی ہوئی رسی کے ذکر کا کوئی موقع نہ تھا۔ نیز پہلے قوافی کا تقاضا یہ تھا کہ یہاں کوئی ایسا لفظ لایا جائے جس کا آخری حرف "ب" ہو۔ اگر مقصود محض شدتِ عذاب ہی کو بیان کرنا ہوتا تو عربی زبان کے محاورات و اسالیب کے وسیع دامن میں کسی مناسب قافیہ کی کمی نہ تھی۔ لیکن یہاں قافیہ کی رعایت چھوڑ دی گئی ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ اس آیت میں ایک اہم حقیقت کا بیان مقصود ہے اور اس میں ایک ایسے امر کا تذکرہ کیا گیا ہے جو واقع ہو کے رہے گا اور ساتھ ہی ساتھ جزا اور عمل کی اس شابہت کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔

۱۴۔ سورہ کا زمانۂ نزول

جو لوگ اس سورہ کے زمانۂ نزول میں موجود تھے ان سے ان کے زمانۂ نزول کے متعلق کوئی روایت ہم تک نہیں پہنچی ہے۔ البتہ

بعض علماء نے قرائن وحالات اور سورہ کے سیاق وسباق سے استنباط کر کے یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ مکہ میں اتری ہے۔ غالباً اس خیال کی بنیاد یہ ہے کہ یہ لوگ اس کو ابولہب کی سخت کلامی کا جواب سمجھتے ہیں۔ ابولہب غزوۂ بدر کے بعد مرا ہے، اس وجہ سے یہ قطعی ہے کہ یہ سورہ اس کی موت سے پہلے اتری ہے۔ اسلوب کلام سے ایسا ہی متبادر ہوتا ہے۔ اگر ابولہب اس کے نزول سے پہلے مر چکا ہوتا تو اندازِ کلام دوسرا ہوتا۔ مثلاً کہا جاتا۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ تَبَّتْ يَدَا اَبِيْ لَهَبٍ دیکھا نہیں دیکھا کس طرح ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے) یا اسی کے مشابہ کوئی اور پیرایہ بیان اختیار کیا جاتا۔ بہرحال یہ قطعی ہے کہ اس میں واقعہ کی خبر وقوع ہونے سے پہلے دی گئی ہے۔ ہم نے عبارت اور اسلوب کلام سے جو مطلب سمجھا ہے روایت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ اوائل بعثت میں نہیں اتری ہے۔ جو لوگ اس دلیل کی بنا پر کہ یہ ابولہب کی سخت کلامی کا جواب ہے اس کا زمانۂ نزول ابتدائے بعثت بتاتے ہیں، ہمارے نزدیک ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ تفصیلات اوپر گزر چکی ہیں۔ یہ سورہ ابولہب کے جواب میں نہیں بلکہ ایک ہونے والے واقعہ کی پیشین گوئی اور خبر ہے، اس وجہ سے لازماً یہ اس وقت اتری ہے جب ابولہب کا کفر پر اصرار بالکل واضح ہو گیا ہے۔ معاملہ اس حد تک پہنچ جانے کے بعد اتمام حجت کا فرض ادا ہو گیا اور خدا کے قانون کے مطابق ضروری ہوا کہ پیغمبر عالم (صلعم) اس سے اعراض فرمائیں۔ چنانچہ اس طرح کے حالات کے لیے خدا کا قانون یہی ہے۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى۔ (۵۳-۲۹و۳۰)	جنھوں نے ہمارے ذکر سے منہ پھیر لیا اور صرف دنیا کی زندگی پر قانع ہو گئے ان سے اعراض کرو، ان کے علم کی رسائی یہیں تک ہے (یعنی وہ اپنے علم کی اس تنگنائے سے نکل کر اس عالم کی چاہ نہیں کر سکتے جو اس عالم سے ماوراء ہے) بیشک تمھارا رب ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹک گئے اور ان کو بھی خوب جانتا ہے جنھوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی۔

یعنی جن کے افعال واقوال سے اس امر کی شہادت مل گئی کہ وہ کفر پر مصر اور آخرت سے بیزار ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو ان سے اعراض کا حکم دیتا ہے۔ جب خداوند تعالیٰ نے اس امر کی خبر دے دی کہ وہ راہِ ہدایت اختیار کرنے والے نہیں تو ان کی ہدایت کی توقع نہ کرو۔ خدا نے ہر چیز کے لیے ایک قانون بنا دیا ہے اور ہر معاملہ کی ایک حد ٹھہرا دی ہے۔ جب کفار کے توبہ کی مدت ختم ہو چکی تو اب ان کے معاملہ میں وہ نرمی نہیں کرے گا۔ چنانچہ فرمایا۔

اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ (۳۵-۳۷)	کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جتنے میں سوچنے والا سوچ لے اور آیا تمھارے پاس ڈرانے والا۔

جب یہ مدت ختم ہو جاتی ہے اور لوگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی واضح ہو جاتی ہے تو خداوند تعالیٰ ان کو دعوت دینے اور ان کے ساتھ وقت ضائع کرنے سے پیغمبر کو روک دیتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۹-۱۱۳)	نبی اور مومنین کے لیے روا نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لیے مغفرت چاہیں، اگرچہ وہ قرابت دار ہی ہوں۔ جب ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ جہنم میں پڑنے والے ہیں۔

اس آیت پر غور کرو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ایک مدت ٹھہرا دی ہے جس میں کفار کے متعلق مومنین کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں بلکہ جہنم میں پڑنے والے ہیں۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (۹-۱۱۴)	اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مغفرت چاہنا نہیں تھا مگر اس وعدہ کی وجہ سے جو اس نے اس سے کیا تھا۔ پس جب اس پر یہ حقیقت کھل گئی کہ یہ اللہ کا دشمن ہے، وہ اس سے بری ہو گیا۔ بیشک ابراہیم نہایت نرم دل اور بردبار تھا۔

جب حضرت ابراہیمؑ کو یقین ہو گیا کہ ان کے باپ پر ایمان کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے تو وہ ان سے بری ہو گئے۔ اس اصول کو سامنے رکھ کر ان کفار کے معاملہ پر غور کرو جن پر خدا نے دنیا میں عذاب نازل کیا اور ان کو ہلاک کر دیا، ان کے متعلق کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ ان کے توبہ کا امکان باقی تھا اس وجہ سے یہ عذاب ان پر ظلم ہوا کیونکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ ان کی ہلاکت اس وقت ہوئی ہے جب یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ایسے ہی کفار کے بارہ میں فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا (۱۰-۱۳)	ہم نے تم سے پہلے بہت سی قومیں ہلاک کر دیں جب انھوں نے ظلم کیا اور ان کے انبیاء کھلی کھلی آیتیں لے کر آئے اور وہ ایمان لانے والے نہیں تھے۔

یعنی مستقبل میں بھی ان کے ایمان کی توقع نہ تھی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان جب جان بوجھ کر ٹھنڈے دل سے برائیوں کا مرتکب ہوتا ہے تو ان کا ضرر نہایت خطرناک ہو جاتا ہے۔ وہ انسان کا ہر طرف سے اس طرح احاطہ کر لیتی ہیں کہ اس پر ہدایت کا دروازہ ہی بالکل بند ہو جاتا ہے اور اس کو گمراہیوں کی تاریکیوں سے نکلنا ہی نصیب نہیں ہوتا۔ کیونکہ خدا نے اعمال اور ان کے نتائج کا جو قانون تمام کائنات میں جاری کیا ہے اس کی زنجیریں اس کو جکڑ لیتی ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ خدا اپنی طرف سے کسی کو گمراہ نہیں کرتا بلکہ انسان خود ہی گمراہی کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۳۰-۹)	اللہ کی شان نہ تھی کہ ان پر ظلم کرتا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔

قرآن مجید نے بہت سے مقامات پر اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ برے اعمال کے نتائج گمراہی، کج دلی، قساوتِ قلب اور جھگڑالوپن کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (۲-۲۶)	اور اس کے ذریعہ سے نہیں گمراہ کرتا مگر نافرمانوں کو۔

دوسری جگہ ہے:

فَلَمَّا زَاغُوٓا أَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ (۶۱-۵)

جب وہ کج ہو گئے تو خدا نے ان کے دل کج کر دیے۔

ایک جگہ ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِم مِّيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً (۵-۱۳)

پس ان کی معاہدہ شکنی کے باعث ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دل سخت کر دیے۔

ایک مقام پر فرمایا:

فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ (۵-۱۴)

پس وہ اس کتاب کا ایک حصہ بھول گئے جس کے ذریعہ سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی تو ہم نے ان کے درمیان عداوت اور بغض کی آگ بھڑکا دی۔

پھر فرمایا:

كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۸۳-۱۴)

ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی سیاہی جم گئی ہے۔

ایضاً:

فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ (۹: ۷۷)

پس اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کے دلوں میں خدا نے نفاق پیدا کر دیا اس دن تک کے لیے جس دن وہ اس سے ملیں گے بوجہ اس کے کہ انھوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی اور بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولے۔

ایضاً

فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِن قَبْلُ ۚ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ (۷-۱۰۱)

اور وہ ایمان لانے والے نہیں تھے کیونکہ انھوں نے اس سے پہلے تکذیب کی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔

ایضاً:

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ۔ (۱۵- ۳)

ان کو چھوڑ دو کھالیں اور نفع اٹھالیں اور اپنی آرزوؤں میں گمن رہیں عنقریب جان لیں گے۔

الغرض اتمام حجت کے بعد دین کی دعوت سے وہ لوگ محروم کر دیے جاتے ہیں جو اپنے کفر و نفاق پر جمے رہنا چاہتے ہیں۔ تعالیٰ ایسے لوگوں سے پیغمبر کو اعراض کرنے کا حکم دے دیتا ہے کیونکہ ان پر عذاب کا قانون پورا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے۔

فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ (۷۰-۴۲)

پس ان کو چھوڑ دو کج بحثیاں کریں اور کھیل لیں یہاں تک کہ اس دن سے دوچار ہوں جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے۔

ان آیات سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ اس سورہ میں ابولہب کی ہلاکت کی جو خبر دی گئی ہے یہ اس وقت سے متعلق ہے جب پیغمبر صلعم نے مایوس ہو کر اس سے اعراض کر لیا ہے۔

۲۔ یہ سورہ ابولہب کو ایمان کی دعوت نہیں دے رہی ہے بلکہ مسلمانوں کو ان کے شدید ترین دشمن کی ہلاکت کی خوشخبری سنا رہی ہے۔ سورہ کے زمانۂ نزول سے متعلق اس قدر واقفیت کافی ہے۔ خواہ اس کا نزول ہجرت سے کچھ پہلے مکہ میں ہوا ہو یا ہجرت کے کچھ بعد مدینہ میں۔ اس تحقیق کا فائدہ اگلی فصل میں معلوم ہوگا۔

۱۵- اس سورہ میں تکلیفِ مالایطاق کا کوئی ثبوت نہیں ہے

اشاعرہ نے اس سورہ سے تکلیف مالایطاق کے وقوع پر استدلال کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کو اس کام کی تکلیف دیتا ہے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتے۔ لیکن حنفیہ اور بعض اکابر شافعیہ مثلاً امام ابو محمد اسفرائنی اور امام غزالیؒ اس رائے میں ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ اشاعرہ کا یہ استدلال ان معتزلہ کے جواب میں ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر عدل واجب ہے۔ اہل سنت کے اکثر فرقے اس وجوب کے نظریہ سے بہت بیزار ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حاکم مطلق ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو پسند کرتا ہے اس کا حکم دیتا ہے۔ وہ سب کا خالق ہے اور تمام جہان اس کی مخلوق ہے۔ مخلوق، خالق پر کوئی چیز کیونکر واجب کر سکتی۔

اس الزام و انکار کے معرکہ نے جیسا کہ اس قسم کی معرکہ آرائیوں کی فطرت ہے۔ نہایت خوفناک شکل اختیار کر لی ہے اور ہر فریق نے آنکھ بند کر کے جس رطب و یابس کو اپنے موافق خیال کیا، دلیل و حجت قرار دے کر حریف کے سر پر دے مارا۔ یہ نزاع درحقیقت اس معرکہ کی ایک شاخ ہے جو مسئلہ عدل پر فریقین میں قائم ہے اور جس کے لیے مناظرہ و مجادلہ کی نہایت خوفناک جنگیں برپا رہ چکی ہیں، اس وجہ سے جب تک اصل مسئلہ اور اس کے متعلقات پر تفصیلی بحث نہ کی جائے، حقیقت بے نقاب نہیں ہو سکتی لیکن چونکہ یہ جگہ اس قسم کی تفصیل کے لیے موزوں نہیں ہے اس وجہ سے ہم اس مسئلہ سے وہیں تک تعرض کریں گے جہاں تک اس سورہ سے اس کا تعلق ہے۔

اس سورہ میں جو خبر دی گئی ہے اس سے امام ابوالحسن اشعریؒ نے تکلیف مالایطاق کے وقوع پر استدلال کیا ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب ابانہ میں فرماتے ہیں:

"اور ان سے (معتزلہ) کہا جائے گا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ مَآ أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ، اور اس کے باوجود اس کو ایمان لانے کا حکم دیا اس طرح اس کے اوپر واجب کیا کہ وہ یہ جانے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کے متعلق اس خبر میں صادق ہے اس کے باوجود حکم دیا کہ وہ ایمان لائے اور ایمان اور یہ علم کہ یہ نہیں ہوگا دونوں جمع نہیں ہو سکتے، صاحب قدرت اس بات پر قدرت نہیں رکھتا کہ وہ ایمان لائے اور یہ بھی جانے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا لیکن جب یہ بات اس طرح ہے تو اللہ تعالیٰ نے ابولہب کو ایسی بات کا حکم دیا جس پر وہ قادر نہیں تھا کیونکہ اس نے اس کو حکم دیا کہ وہ ایمان لائے اور وہ جانتا تھا کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔"

لیکن اس استدلال میں دو باتیں فرض کر لی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سورہ کا مخاطب ابولہب ہے اور اس کو اس بات کا یقین کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ دوسری یہ کہ یہ سورہ ابولہب پر اتمام حجت اور آنحضرت صلعم کے اعراض سے پہلے نازل ہوئی ہے، حالانکہ فصل سابق میں ان دونوں شبہوں کی بہ دلیل تردید کی جا چکی ہے۔ اس وجہ سے اس استدلال کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہے۔

امام رازیؒ نے اس دلیل کو جمع بین النقیضین کے قالب میں ڈھال کر اس کو ایک نئے آب و رنگ سے پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک استدلال کی صورت یہ ہے کہ یہ اجتماع نقیضین ہے جو بالبداہۃ محال ہے اور محال پر کسی کو قدرت نہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے محال کا حکم دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تکلیف مالایطاق دیتا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"اہل سنت نے تکلیف مالایطاق کے وقوع پر اس بات سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابولہب کو ایمان کی تکلیف دی اور منجملہ ایمان کے ان تمام باتوں کی تصدیق بھی ہے جن کی خدا نے خبر دی ہے اور جن امور کی خبر دی ہے ان میں سے یہ بات بھی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ اور وہ دوزخی ہے۔ اس طرح وہ اس بات کا بھی مکلف ہوا کہ وہ ایمان لائے گا اور اس بات کا بھی کہ ایمان نہیں لائے گا اور یہ جمع بین النقیضین کی تکلیف ہے۔ اور یہ محال ہے۔"

اس کے بعد معتزلہ کی طرف سے دو مبہم جواب دے کر ان کی تردید کی ہے اور آخر میں یہ کہہ کر کہ "یہ اشکال علی حالہٖ قائم ہے" آگے بڑھ گئے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ جمع بین النقیضین والی دلیل مختلف وجوہ سے باطل ہے۔

۱۔ یہ دلیل اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتی جب تک دو باتیں ثابت نہ ہو جائیں۔ ایک یہ کہ جس وقت یہ سورہ اتری ہے اس وقت ابولہب ایمان کا مکلف تھا اور اعراض کا مستحق نہیں ہوا تھا۔ دوسری یہ کہ وہ اس سورہ میں مخاطب کیا گیا ہے۔ ہم پچھلی فصل میں بہ تفصیل بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو ان لوگوں سے اعراض کا حکم دیا ہے جو اتمام حجت کے بعد بھی نشۂ غرور میں مست اور اپنے کفر پر مصر رہیں، اس وجہ سے حریف یہ کہہ سکتا ہے کہ جس وقت یہ سورہ اتری ہے اس وقت ابولہب ایک تکلیف کا بھی مکلف نہ تھا، چہ جائیکہ دو تکلیفوں کا۔

۲۔ حریف کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ کفار سے جزئیاتِ احکام پر ایمان لانے کا اس وقت تک مطالبہ نہیں ہے جب تک وہ کلمۂ توحید اور اطاعتِ رسول کا اجمالی اقرار نہ کر لیں۔ اس منزل سے گزر چکنے کے بعد وہ ایمان تفصیلی کے مکلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنزَلَ مِن قَبْلُ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا (۴-۱۳۶)

اے ایمان والو، اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اتاری اپنے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اس نے اتاری، ایمان لاؤ اور جو لوگ اللہ، اس کے ملائکہ، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت کا انکار کریں گے وہ نہایت سخت گمراہ ہوئے۔

اس وجہ سے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ابولہب ایمانِ اجمالی کا مکلف تھا تو بھی یہ تسلیم کرنا ضروری نہیں کہ وہ اس سورہ کا بھی مخاطب ہے اور جو کچھ اس میں خبر دی گئی ہے اس پر ایمان لانے کا بھی مکلف ہے۔ اس صورت میں جمع بین النقیضین نہیں باقی رہتا۔

۳۔ قرآن نے یہ خبر نہیں دی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا اور نہ یہ کہا ہے کہ وہ دوزخی ہے۔ اس نے محض یہ خبر دی ہے کہ وہ بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔ محض آگ میں پڑنا اس بات کے لیے مستلزم نہیں کہ وہ ایمان نہیں لائے گا، اور دوزخ میں ہمیشہ رہے گا۔

۴۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن نے اس کے دوزخی ہونے کی خبر دی ہے تو کیا یہ خبر بعینہٖ اس بات کی خبر ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا؟ سب کو معلوم ہے کہ کفار قیامت کے روز ایمان لائیں گے، تاہم ان کو یقین ہو گا کہ وہ دوزخی ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ تصدیق دلائل کے تابع ہے، جب کسی شخص کے سامنے کسی چیز کے دلائل واضح ہو جائیں گے تو وہ اس کی تصدیق کر دے گا۔ اور باوجود اس کے اگر اس کے سامنے اس بات کے دلائل بھی واضح ہوں کہ وہ مستحق نار ہے تو اس میں داخل ہونے کا بھی یقین کرے گا۔

دیکھو اللہ تعالیٰ نے فرعون کے اقرارِ ایمان کا کیا جواب دیا۔ قرآن مجید میں ہے۔

حَتَّىٰ إِذَا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ آمَنتُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا الَّذِي آمَنَتْ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ آلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ (۱۰-۹۰، ۹۱)

یہاں تک کہ جب ڈوبنے کا وقت آ گیا اس نے کہا کہ میں ایمان لایا، نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ اب، حالانکہ تم نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تم فساد پھیلانے والوں میں سے تھے۔

اس میں خداوند تعالیٰ نے یہ جواب نہیں دیا کہ تو ایمان نہیں لایا، یا تو اسلام نہیں لایا، بلکہ یہ فرمایا کہ قبولِ ایمان و اسلام کا وقت گزر گیا۔

اسی طرح دوسری جگہ ہے:

يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۖ فَإِن تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ۔

وہ تم سے قسمیں کھاتے ہیں کہ تم راضی ہو جاؤ ان سے اگر تم ان سے راضی بھی ہو گئے تو اللہ نافرمان قوم سے راضی نہ ہو گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ نفس فعل اور اس کے مقبول ہونے میں بڑا فرق ہے۔ بندہ صرف فعل کا مکلف ہوتا ہے اس کی قبولیت کا مکلف نہیں ہوتا۔ الغرض اگر دخولِ نار اور ایمان میں کوئی تناقض ہوتا تو کسی حالت میں بھی مجتمع نہ ہو سکتے، لیکن بعض حالتوں میں ان کا اجتماع معلوم ہے، اس وجہ سے تناقض باقی نہیں رہا۔

۵۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن نے خبر دی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا بلکہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا تو سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان باللہ اور اطاعت رسول کی تکلیف دی تھی، یا اس بات کی کہ وہ یقین کرے کہ وہ مومن ہے اور جہنم سے محفوظ رہے گا؟ پھر تناقض کہاں رہا۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایمان دلائل کا نتیجہ ہے لیکن عمل صالح کے لیے کوئی وجہ رغبت ناگزیر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دے دی ہے کہ ابولہب دوزخی ہے تو جس عمل کا وہ مکلف ہے اس کے لیے آخر کس منفعت کی امید محرک ہو گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نفع کی امید کسی حال میں بھی منقطع نہیں ہو سکتی کیونکہ عذاب کے مدارج ہیں، اس وجہ سے نیک عمل ممکن

ہے دنیا میں کچھ نفع بخش ہو یا آخرت میں اس کے آلام میں کچھ تخفیف کا باعث ہو۔ جو بیماریاں دور نہیں ہوسکتیں ان کا بھی علاج کیا جاتا ہے کہ ممکن ہے ان کی اذیت ہی کچھ کم ہو جائے۔ نیز عمل صالح فی نفسہٖ مرغوب اور خوب صورت ہونے کے علاوہ حسنِ شہرت اور ستائش کا باعث ہے، اس لیے دلائل قرآن اس کے سامنے ان چیزوں کو ثابت کرتے ہیں جن پر اس کو ایمان لانا چاہیے اور اس نفع کی امید اس کے لیے عمل کی محرک ہو سکتی ہے اگرچہ اس کو یقین ہو کہ وہ خدا کے مقبول بندوں میں نہیں داخل ہو سکتا۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس استدلال کی صحت ایسی باتوں کے فرض کرنے پر مبنی ہے جن کی نہ صرف یہ کہ کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ دلیلیں ان کے خلاف ہیں۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ صاحب استدلال نے جو دو تکلیفیں فرض کی ہیں اگر ان کو تسلیم بھی کر لیا جائے جب بھی کوئی تناقض لازم نہیں آتا۔ کیونکہ ان کا یہ دعویٰ کہ "وہ اس بات کا بھی مکلف ہوا کہ ایمان لائے گا اور اس بات کا بھی کہ ایمان نہیں لائے گا" ایک کھلا ہوا مغالطہ ہے۔ وہ اس بات کا مکلف تھا کہ ایمان لائے، اس بات کا مکلف نہیں تھا کہ ایمان لائے گا، ان دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے، کیونکہ اس کو اس بات کی تکلیف نہیں دی گئی تھی کہ وہ ایمان لائے گا بلکہ اس کو اس بات کی تکلیف دی گئی تھی کہ وہ ایمان لائے یعنی آنحضرت صلعم کی تعلیم پر ایمان لانے کی اور اس بات پر ایمان لانے کی کہ وہ ایمان نہیں لائے گا اور ان دونوں ایمانوں میں کوئی تناقض نہیں ہے، اسی طرح اس اخیر صورت میں بھی کوئی تناقض نہیں ہے کیونکہ معلوم ہے کہ تمام کفار بحالتِ کفر اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

ان دلائل سے یہ بات صاف ہو گئی کہ اجتماع نقیضین کا دعویٰ غلط ہے۔ اس لیے استدلال اسی شکل میں باقی رہا جس شکل میں امام ابوالحسن اشعریؒ نے ابانہ میں پیش کیا ہے، اس کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں کہ اس کی بنیاد ہی غلط ہے۔ اس میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ دعوتِ ایمان کا بھی مخاطب۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی کہ اپنے کفر اور دخولِ نار پر ایمان لائے حالانکہ یہ خبر اس وقت دی گئی ہے جب اس سے اعراض کر لیا گیا ہے جیسا کہ پچھلی فصل میں گزر چکا ہے۔

الغرض جو لوگ تکلیف مالایطاق کے مدعی ہیں ان کے مفید مطلب اس سورہ میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ رہا اصل مسئلہ تو اس پر مفصل بحث ہم نے علیحدہ کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ نزاع محض لفظی ہے۔ امام اشعریؒ کا رتبہ اس سے ارفع ہے کہ ان کی طرف ایک ایسا عقیدہ منسوب کیا جائے جس سے ذات باری کی طرف ظلم کی نسبت ہوتی ہے۔ ہماری ناقص سمجھ میں اس سورہ کی جو تفسیر آئی تھی وہ ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے۔